ڈی۔ راج۔ کنول

ایم۔اے

پھول کھلے ہیں..

ڈی۔ راج۔ کنولؔ
ایم۔ اے

ڈی۔ راج۔ کنول ایم۔ اے

سالِ اشاعت ۔ ۱۹۸۲ء
طباعت جمال پرنٹنگ پریس دِلّی
کتابت نیب راج شرما
سرورق سیماؔب سلطانپوری
تعداد ۵۰۰
قیمت ۲۰ روپے

ناشر
حلقہ تشنگانِ اَدب نئی دلّی

ملنے کا پتا

۱۔ منجو شرما جی ۲۹ کالکاجی نئی دلی ۱۹
۲۔ پروفیسر اوِناش شرما مکان ۳۱۱ فیز I مُہالی
۳۔ سیماؔب سلطانپوری چنڈی گڑھ
۱۱۹۶ سیکٹر II آر۔ کے۔ پورم نئی دلّی ۲۲
۴۔ شری جوند لعل شرما ۳۱۔ بی پرانا جواہر نگر
لاڈو والی روڈ۔ جالندھر شہر
۵۔ برہمانند شرما جلیس ۲۳۹ سیکٹر VI آر۔ کے۔ پورم
نئی دلی ۲۲

فہرست

اِظہارِ مسرّت

مجھے بے حد خوشی ہے کہ میں چند الفاظ اپنے جگری دوست کی شائع ہونے والی کتاب "پھول کھلے ہیں" کے بارے میں لکھ رہا ہوں - یہ کتاب شری دیس راج کنول کے دل و دماغ کی قوّت کا خوشنما نمونہ ہے۔ اِسے پڑھ کر لوگوں میں زندہ دلی کی لہر دوڑ جائے گی، اَور وہ دیش کی بہبودی اَور ترقی میں پورا ہاتھ بٹا سکیں گے۔ جس کی ہندوستان کو پُر زور ضرورت ہے - مَیں چاہوں گا کہ یہ کتاب دوسری زبانوں میں بھی شائع ہو۔

ڈاکٹر پریم ساگر سُود

سابقہ پرنسپل گورنمنٹ کالج ۔ اَلور

اِینا اور اَدوش

کے نام

Dr. N.P. Seshadari
Jt. Development Commissioner
(Handlooms)
Ministry of Commerce
Government of India

Founder-Secretary,
National Cultural Organization.

New Delhi March 17, 1982

I am delighted to know that Poet Des Raj Sharma is bringing out a publication of his beautiful compositions. Shri Sharma is the 'Pride of India' and is a poet of natural and immeasurable merit. Sweetness and imagination coupled with feelings and love is the very essence of his compositions and I am sure that this publication will become an additional asset to the country's abundance natural Culture. He has participated in many national and international seminars and symposiums and has enriched their deliberations with his enchanting and colourful poetry. I wish this great publication all success.

N.P. Seshadri
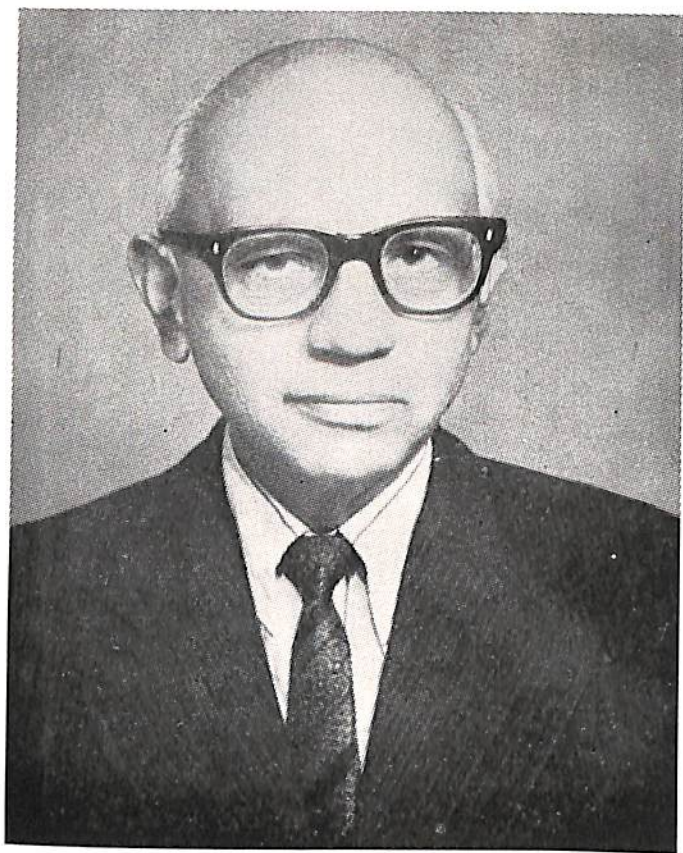
ڈی۔ راج۔ کنول ایم۔ اے

ڈاکٹر این۔پی۔شیشادھری

راجندر ناتھ رہبر

برہمانند جلیس

سیماب سلطانپوری
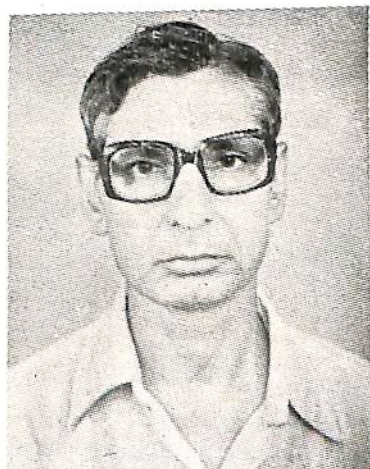
تقریظ

برادرم دیس راج کنول سے میری پہلی ملاقات شملہ کی ان پہاڑیوں میں ہوئی جہاں مئی اور جون کے مہینوں میں ہندوستان کی روح پرور انسانی خوب صورتی ایک نقطہ پر آکر سمٹ جاتی ہے۔ کچھ تو کنول انسان پرست ہیں، کچھ شملہ کا رہنے والا کسی طور صوبائی یا مذہبی تعصب کا شکار ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ چار اطراف فطرت اپنے پر لطف مناظر بکھیرتی رہتی ہے اور انسان انسان میں تفریق کرنا غیر مناسب سمجھتی ہے۔ یہاں تک کہ سورج غروب ہوتے ہوئے بھی وہ سرخیاں بکھیر جاتا ہے کہ آنے والی شام غروب خورشید کے منظر کا وعدہ ڈوبتی ہوئی کرنوں میں پرو دیتی ہے ۔ ایسے ماحول میں میں نے کنول کے ساتھ مال پر ایک شریف آوارہ گرد کی طرح کئی شامیں بسر کی ہیں۔ ان کی شاعری ان کی اپنی شرافت اور ماحول کی خوبصورتی کی ہر قدم عکاسی کرتی ہے اور جب وہ روز و شب یاد آتے ہیں جب ہم ہات میں ہات ڈال کر گھوما کرتے تھے تو انکا یہ شعر بھی زبان پر آجاتا ہے

وقت کے سینے میں رہ جاتی ہیں یادیں باقی
جیسے کچھ کیلیں گڑی رہتی ہیں دیواروں میں

لیکن ماضی صرف آنسوؤں ہی سے عبارت نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ سالہا سال کی غریب الوطنی کے بعد قہقہے بھی آنسوؤں میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور زندگی انہیں دو شرابوں کا ملا جلا سیال ہے ۔ دکھ اور سکھ کا۔ آنسوؤں اور قہقہوں کا ۔ بقول کنول ؎

خوشیوں کی مے۔ غموں کا نشہ، موت کا سرور
اس زندگی سے بڑھ کے کوئی میکدہ نہیں

فراسٹ بھی اسی عقیدہ کے قائل ہیں۔ محبت کرنے کے لئے اس دنیا سے بہتر کوئی جگہ۔

نہیں اور کنول کے یہاں ہر اچھے شاعر کی طرح جینے کی آس ہے، جینے کا پیام ہے۔ کہ اچھی شاعری ہر ممکن طریقے سے زندہ رہنے کی تلقین کرتی ہے

دھوپ خوشیوں کی نکل جائے گی ہو کر پاس سے
تان کر غفلت کی چادر اس قدر سویا نہ کر

جس شخص نے فطرت کی گود میں رہ کر زندگی گزاری ہو۔ اس کے یہاں تلمیحیں بھی نیچرل ہونگی اور پھر کنول خود بھی تو ایک پھول کی طرح ہیں۔ کنول کے پھول کی طرح۔ جس میں خوشبو خوبصورتی، رنگ مل جل کر ایک ہو گئے ہیں اور پھر ان کے یہ دو شعر ان کے لاشعور کی داستان بھی ہیں۔ پھولوں کی زبان میں :۔

(۱) کل صبح ایک شاخ پہ دو ادھ کھلے گلاب
تھوڑا سا مسکرا کے بہت سوچتے رہے

(۲) وہ مہک جوان کے بدن کی تھی مرے پاس ایسے پہنچ گئی
وہ جوان کے ہاتھ سے گر پڑے وہی پھول میں نے اٹھا لئے

دوسرا شعر فطرت اور انسان کے باہمی تعلق کی داستان ہے۔ ایک ایسا تعلق جسے ہندوستانی اساطیر نے انانیت عطا کی ہے۔

کنول کے یہاں علامتیں بھی ہیں تشبیہیں بھی۔ زبان کی چاشنی بھی ہے اور خیال کی شعریت بھی لیکن ان کے یہاں سب سے زیادہ پراثر زندگی کے سفر کی وہ داستان ہے جس میں عزم شرطِ اوّل ہے۔

جب عزم سفر کر ہی لیا آؤ چلیں ہم
طوفان کے تھمنے کے تو آثار نہیں ہیں

گلہ ہے تو صرف اتنا کہ یہ مجموعہ جس میں ایک ذہین شاعر کے تصوّر اور شعور نے شعری لبادہ پہنا ہوا ہے۔ اتنی دیر بعد کیوں منظرِ عام پر آیا ہے۔ کاش کنول اتنی تساہل پسندی سے کام نہ لیتے۔ گو مجھے یقین ہے کہ دس سال پہلے بھی اس مجموعہ کی اتنی ہی قدر و منزلت ہوتی جتنی آج ہو گی۔

بمل کرشن اشک
ڈیپارٹمنٹ آف انگلش
(ایم۔ ڈی۔ یو)

جناب ڈی۔ راج۔ کنولؔ

اَور

اُن کا اندازِ کلام

آج سے تقریباً ۲۰ - ۲۲ سال پہلے نظیری نیشاپوری کا درجِ ذیل شعر پڑھ کر دل پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو گئی تھی ؎

پایم بہ پیش از سرِ ایں کُو نمے رَود
یاراں خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہِ کیست

اَور اسی وقت سے یہ شعر دل و دماغ پر نقش ہو گیا تھا۔ لیکن حلقۂ تشنگانِ اَدب کی ایک ماہانہ طرحی نشست میں جب جناب ڈی۔ راج۔ کنولؔ صدر حلقہ (اس وقت آپ حلقۂ تشنگان ادب کے صدر تھے) کی غزل کا یہ شعر سُنا تو مَیں چونک اٹھا۔ ہر طرف سے واہ! واہ! کی صدا گونج اٹھی ؎

اٹھتے ہی نہیں اور کسی سمت قدم اَب   یہ کونسی منزل ہے کہاں آئے ہوئے ہیں

ایک اچھے شعر کی تعریف یہی ہے کہ وہ "از دل خیزد و بر دل ریزد" کی خوبی کا حامل ہو اور یہ خوبی سادگیٔ بیان ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ مقبولِ خاص و عام وہی کلام ہوتا ہے جو حُسنِ معنی اور حسنِ بیان کے ساتھ ساتھ سادگیٔ زبان اور سلاست زبان کے زیور سے آراستہ ہو۔ کنول صاحب کے کلام میں یہ خوبی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ جس کے طفیل آپ کو قبولِ عام اور پسندِ خاص کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔

جس ماحول میں شاعر کی زندگی گزرتی ہے۔ اس کا اثر اس کے دِل و دماغ، فکر و نظر اور طبیعت پر ضرور پڑتا ہے۔ جو بالآخر اس کی شاعری میں بھی

ظہور پذیر ہوتا ہے۔ کنول صاحب کا سنجیدہ اور پر تاثیر کلام بھی اسی حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ اُفتادِ طبع کی اسی ہم آہنگی کے سبب کنولؔ، میر تقی میرؔ اور فانیؔ بدایونی کے کلام سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہوتی ہیں اس پہ گریۂ پیہم کی یورشیں
گویا یہ میرا دل بھی کوئی سومنات ہے

آنسو کی ایک بوند کلیجہ نگل گئی
پتھرؔ کو ایک قطرۂ سیماب لے گیا

کل صبح ایک شاخ پہ دو اَدھ کھلے گلاب
تھوڑا سا مسکرا کے بہت سوچتے رہے

کنول صاحب کے کلام میں 'یاسیت' کا وہ پہلو جو فانیؔ بدایونی کے کلام کا خاصہ ہے، نہیں ہے۔ انکے کلام میں روشنی کی وہ جھلک پائی جاتی ہے جو رہروِ زیست کے لئے مشعلِ راہ کا حکم رکھتی ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

نور ہی نور ہے ظلمات کے آئینے میں
رقص کرتی ہے سحر رات کے آئینے میں

کیا ہوا شام دھواں بن کے جو آئی ہے کنولؔ
چاند اُبھرے گا ابھی رات کے آئینے میں

چاندنی رات کی نادر تشبیہہ جو استاد ذوقؔ کے درج ذیل شعر میں نظر آتی ہے۔ اس سے پہلے کسی شاعر کے کلام میں نہیں دیکھی گئی ؎

ے افسردہ دل کے واسطے کیا چاندنی کا لطف ۔ لپٹا پڑا ہے مردہ سا گویا کفن کے ساتھ
اسی نادر تشبیہہ کو اب ذرا کنول صاحب کے اندازِ فکر کے آئینے میں ملاحظہ کیجیے اور
جی بھر کر داد دیجیے ے

ے وقت ہوتا ہے دنیا میں ہر چیز کا　　وقت پر چیز لگتی ہے اچھی بُری
چوٹ کھائے ہوئے آدمی کے کنول　　پھونک دیتی ہے قلب و جگر چاندنی

اس کے علاوہ اور بھی نادر تشبیہات جو کنول صاحب کی ندرتِ خیال کا اعلیٰ نمونہ
ہیں ان کے کلام میں جابجا پائی جاتی ہیں ۔ دو شعر ملاحظہ ہوں ے

کس نے پلکوں پہ مری ٹانک دیئے ہیں آنسو ۔ ایک دلہن کی کلائی پہ کلیروں کی طرح
وقت کے سینے میں رہ جاتی ہیں یادیں باقی ۔ جیسے کچھ کیلیں گڑی رہتی ہیں دیواروں میں

زندگی کو میکدہ سے تشبیہہ تو بہت شاعروں نے دی ہے ۔ مگر جن لوازمات کا کنول صاحب
نے استعمال کیا ہے وہ واقعی قابلِ داد ہے ۔ ملاحظہ ہو ۔ ے

خوشیوں کی مے، غموں کا نشہ موت کا سرور ۔ اس زندگی سے بڑھ کے کوئی میکدہ نہیں

غالب کا یہ شعر زبان زدِ عام ہے ے

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے ۔ صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

اب ذرا اسی مفہوم کو کنول صاحب کے شعر میں ملاحظہ کیجیے اور انکی پرواز فکر اور
کمالِ سخن کی داد دیجیے ے آئینہ دیکھ کر نہ شرمائیں ۔ یہ بھی تصویر آپ ہی کی ہے
'تہذیبِ نو' کے دورِ حاضر کے متعلق آنجہانی ڈاکٹر منوہر سہائے انور کا یہ شعر جس میں
ایک طنز کا پہلو بھی ہے اب تک وردِ زبان ہے ۔ ے

یہ کیا اندھیرا ہے اے عصرِ تہذیب ۔ اندھیرا اور اتنی روشنی میں

کنول صاحب نے بھی اسی تہذیبِ نو کا مشاہدہ کیا ہے اور اسی مفہوم کو جو ڈاکٹر
منوہر سہائے انور کے مندرجۂ بالا شعر میں ہے اپنے شعر میں یوں بیان کیا ہے ۔ ے

روشنی چھن رہی ہے ہر جانب ۔ پھر بھی ہر راستہ اندھیرا ہے

مفہوم دونوں اشعار کا ایک ہی ہے ۔ مگر انداز اپنا اپنا ہے ۔ لطافتِ زبان اور
حسنِ بیان کے اعتبار سے دونوں شعر یکساں ہیں ۔
قوافی کے حسنِ انتخاب کے سلسلہ میں استادِ محترم آنجہانی قبلہ جوش ملسیانی

مجھے استاد ذوقؔ کا یہ شعر اکثر سنایا کرتے تھے :-

میں ہجر میں مرنے کے قریں ہو ہی چکا تھا
آپ آ ہی گئے آج نہیں ہو ہی چکا تھا

فرمایا کرتے تھے کہ مصرعۂ ثانی میں حرفِ قافیہ "نہیں" کا انتخاب کس قدر پر لطف ہے۔ یہ فقط ذوقؔ ہی کا حصہ ہے۔

یہی حسنِ انتخاب کنولؔ صاحب کے درجِ ذیل شعر میں ملاحظہ فرمائیے اور ان کے حسنِ طبیعت کی داد دیجیے

یہ سنتا ہے کہ پونم کی ہر رات کو شہ جہاں اور ممتاز کی یاد میں
رقص کرتی ہوئی تاج کے ہر طرف سنگِ مرمر پہ جاتی ہے مر چاندنی

کنولؔ صاحب کے اس شعر میں دو خوبیوں کا اور اضافہ ہے۔ اول یہ شعر تلمیحی ہے، دوسرے سنگِ مرمر کے لفظ کے ساتھ 'مر' حرفِ قافیہ کا انتخاب یقیناً ان کے کمالِ سخن کی دلیل ہے۔

کنولؔ صاحب ایک سادہ اور بے تکلف شخصیت کے حامل ہیں۔ یہی جوہر ان کے کلام میں نمایاں ہے۔ کسی قسم کا تصنّع اور تکلف نہ ان کی شخصیت میں موجود ہے نہ کلام میں۔ ان کے کلام میں سادگیٔ بیان، حسنِ معنی، لطفِ زبان اور شگفتگی کے ساتھ ساتھ وہ حیات آفریں پیغام بھی ہے جس سے طبیعت کو تازگی اور روح کو بالیدگی ملتی ہے۔ "پھول کھلے ہیں۔۔۔" انہیں خوبیوں پہ مشتمل ایک حسین و جمیل مرقع ہے۔ جو بزمِ شعر و سخن میں ایک روشن کنول کی طرح ضو پاش ہو رہا ہے۔

ہمیں اُمید ہی نہیں بلکہ یقینِ واثق ہے کہ اربابِ ذوق اس مرقعِ سخن کو دیدۂ دل میں جگہ دیں گے اور اسے ادبی حلقوں میں وہ بلند مقام حاصل ہو سکے گا جس کا کہ یہ مرقعِ سخن "پھول کھلے ہیں۔۔۔" بجا طور پر مستحق ہے۔

۳۰ ۸/ ۸۲

برہما نند جلیسؔ ایم اے
نائب صدر حلقۂ تشنگانِ ادب
نئی دہلی

شخصیّت اور فن

جناب ڈی۔ راج۔ کنول کی شریف النفسی، پُرخلوص طبیعت اور معیاری اخلاق کے بعد اُن کی جو بات مجھے بے حد متاثر کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اُنہوں نے اپنی شاعری کا سفر مسلسل جاری رکھا۔ انہوں نے اپنے کام میں تعطّل نہیں آنے دیا اور محنتِ شاقہ اور دِلی لگن کے طفیل دنیائے شعر و ادب میں اپنے لئے ایک قابلِ رشک مقام حاصل کر لیا ہے۔ وہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرم رہتے ہیں اور اسی جستجو کے دوران اُن کی متجسّس نگاہیں نئی نئی منزلوں کی نشاندہی کرتی رہتی ہیں۔ وُہ دُور کی منزلوں کے راہی ہیں اَن دیکھی منزلوں کی کشش انہیں اپنی طرف کھینچتی ہے۔ وہ ایک البیلے مسافر کی طرح جھومتے گاتے شعر و ادب کی سرسبز وادی میں، راہ کی دُشواری و پُرخاری کی پرواہ کئے بغیر آگے ہی آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں اور جب وہ تھک کر بیٹھتے ہیں تو کہہ اُٹھتے ہیں :-

سے محدود ہیں اپنی ہی نظروں کی حدیں ورنہ
اِن چاند ستاروں سے آگے بھی ستارے ہیں

اُن کی دوسری خوبی جو مجھے متاثّر کرتی ہے۔ وُہ یہ ہے کہ وہ مُشکل الفاظ اور فارسی تراکیب کے بل بوتے پر اپنا سکّہ جمانے کی کوشش نہیں کرتے۔ وُہ اپنے جذبات و احساسات کو عام فہم اور سادہ الفاظ میں نہایت مؤثر پیرایہ میں ادا کرنے کا فن خوب جانتے ہیں۔ موٹے موٹے الفاظ کا سہارا لے کر اچھا شعر تخلیق کر لینا کوئی بڑی بات نہیں البتہ سلیس اور عام فہم زبان میں مؤثر شعر کہنا واقعی مشکل کام ہے۔ مثال کے طور پر کنول صاحب

کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔ اس میں کوئی مشکل لفظ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔ پھر بھی تاثر کے اعتبار سے یہ شعر بڑا دلپذیر اور جاندار ہے۔

؎ وقت کے سینے میں رہ جاتی ہیں یادیں باقی
جیسے کچھ کیلیں گڑی رہتی ہیں دیواروں میں

محبوب کی جدائی میں رونے اور آنسو بہانے کے موضوع پر ہر دور کے شعراء نے اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں اور طرح طرح کی شاعرانہ مبالغہ آمیزی سے کام لیا ہے۔ کنول صاحب نے بھی اس مضمون کو اپنے ایک شعر میں باندھا ہے جسے بہ آسانی ہمارے عہد کے بہترین اشعار کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے

؎ روئے شبِ فراق ہم اتنا کہ اے کنول
دامن نچوڑتی ہوئی اپنا، سحر گئی

کنول صاحب اس راز سے بخوبی آگاہ ہیں کہ ہر تاریک رات کا مقدر سحر کی طرح تابناک ہے اور یہ حقیقت بھی ان پر روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ اُجالا ہمیشہ تیرگی ہی سے پھوٹتا ہے۔ اسی لئے تو انہوں نے ایسا حوصلہ افزا شعر کہا ہے جس کی دلآویزی ان کے محاسنِ شعری کی قسم کھا رہی ہے

؎ نور ہی نور ہے ظلمات کے آئینے میں
رقص کرتی ہے سحر رات کے آئینے میں

کنول صاحب کی شاعری کی اساس خلوص اور دردمندی پر ہے۔ یہ دونوں جذبے ان کے اشعار میں تازہ لہو کی طرح دوڑتے نظر آتے ہیں۔

؎ ملنے کی اُن سے ایک ہی صورت تھی اے کنول
ہم خاک بن کے راہ میں ان کی بکھر گئے

آج کل نئی نئی ردیفیں اور نئے نئے قافیئے تلاش کرنے اور ان سے

نئی نئی کیفیاتی تصویریں سجانے کا رجحان عام ہے ۔ کنولؔ صاحب کے ہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں ۔ ایک شعر ملاحظہ ہو ۔ ردیف اور قافیہ جادو بن کر بول رہے ہیں

تجھ سے ملے ہوئے تو زمانے ہوئے ، مگر
تازہ ہیں آج تک بھی تری گفتگو کے پھول

جناب کنولؔ اُردو شاعری کی قدیم ادبی روایات کا احترام بھی کرتے ہیں اور جدید شعری تقاضوں کا خیر مقدم بھی ۔ اِسی لئے اُن کے کلام میں شاعری کے ان دونوں رنگوں کا امتزاج ملتا ہے جو ہر لحاظ سے قابلِ تعریف ہے اِس معاملہ میں وہ اِس خیال کے حامی نظر آتے ہیں :-

ہر چند نیا ذہن دیا ہم نے غزل کو ؎
دِل ہے کہ مگر پاسِ روایات کرے ہے

یہ جان کر مسرّت ہوتی ہے کہ ان کا مجموعۂ کلام زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آ رہا ہے ۔ میری دِلی دُعا ہے کہ ان کے کلام کی ادبی اہمیت کا اعتراف عوامی سطح پر بھی ہو اور سرکاری سطح پر بھی ۔

آمین !

راجیندر ناتھ رہبرؔ

۸۲/۲/۳

پیغام

شری دیس راج کنول میرے بھائی کے برابر ہیں۔ میں اُن کی شاعری کا قائل ۱۹۴۵ء سے ہوں جب میری اُن سے پہلی ملاقات شملہ میں ہوئی۔ ان کے گیتوں میں اُمنگ اور ترنگ ہے۔ ان کی نظموں میں درد اور جوش ہے۔ ان کی غزلوں میں مچلتی ہوئی زندگی اور چھلکتا ہوا پیار ہے۔ اُن کے شعروں میں فلسفہ اور آسمانوں کو چھوتی ہوئی اُڑان ہے۔ وہ سراپا محبت اور خلوص کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ میری دِلی دعا ہے کہ ان کا مجموعہ کلام "پھول کھلے ہیں" کنول کے پھولوں کی طرح چاروں طرف مہک اٹھے۔

شوبھا رام
آئی۔ آر۔ ایس
انکم ٹیکس آفیسر (ریٹائرڈ)
دہلی

دِل کا مطلب ادا کرے کوئی

جب کوئی شاعر یا ادیب ظاہراً کچھ لکھ نہیں رہا ہوتا تو دراصل وہ لکھ رہا ہوتا ہے اور اس کے برعکس جب وہ کاغذ قلم لے کر تحریر کی سعی میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ لکھ نہیں رہا ہوتا۔ ٹھیک ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہوا۔ جب تک میں نے یہ سطور رقم نہیں کی تھیں تو یوں لگتا تھا کہ سب باتیں سب خیالات میرے پاس موجود ہیں۔ جب چاہوں گا بآسانی کاغذ پر اتار لوں گا۔ مگر ایسا ممکن نہیں ہوا اور پتہ چلا کہ لکھنا اتنا آسان امر نہیں ہے جتنا کہ سوچا۔ کاغذ پر وہ سب کچھ تحریر نہیں ہو سکتا جو کہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جو فرق کھلی آنکھوں سے دیکھے گئے مناظرِ قدرت میں اور ان کی تصاویر میں ہوتا ہے' بالکل وہی فرق تخیّل اور تحریر میں ہوتا ہے۔

یہاں تو اور بھی مشکل درپیش ہے۔

جس استادِ فنِ موسیقی نے سرگم کا 'سا' کہنا سکھایا ہو۔ اس کے سامنے گانے اور سُر لگانے کے لئے منہ کھولنا، جس نے ایک ایک لفظ کو دس دس بار ادا کر کے بولنا سکھایا ہو۔ اس کے سامنے تقریر کرنا اور جس استاد نے طفلِ مکتب سمجھ کر قلم ہاتھ میں تھمایا ہی نہیں، بلکہ ہاتھ پکڑ کر 'ا۔ب' لکھنا سکھایا ہو، اس کے سامنے زورِ قلم دکھانا نہایت مشکل ہوتا ہے۔ بلکہ میں کہوں گا کہ حماقت سے کم نہیں ہوتا۔ میری حالت کا اندازہ شاید اب تک آپ نے لگا لیا ہو۔ قلم ہے کہ کانپ رہا ہے الفاظ ہیں کہ لرزتے پھسلتے دکھائی دیتے ہیں۔ جو نوکِ قلم پر آتے ہی غائب ہو جاتے

ہیں۔ بقول شاعر ع۔ "بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی" اور پھر یہ بھی ہے کہ اگر کسی کے عیوب گنوانے ہوں تو بہت آسانی سے بہت کچھ دیکھا سُنا ذہن میں آجاتا ہے۔ مگر جب کوئی نہایت قابلِ احترام اور قابلِ صد ستائش و تعریف شخصیت پیشِ نظر ہو تو معاملہ اور بھی پیچیدہ نظر آتا ہے اور اس حالت میں کچھ بھی کہہ سکتا اتنا آسان نہیں ہوتا۔

مکرمی جناب پنڈت ڈی۔ راج۔ کنولؔ، بے شک میرے استادِ محترم ہیں انہوں نے ہمیشہ مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح عزیز رکھا ہے اور ہر قدم پر میری راہنمائی اور حوصلہ افزائی کی ہے مجھے اس بات پر بھی فخر ہے کہ انہوں نے اپنے شعری مجموعۂ کلام "پھول کھلے ہیں ۔۔۔" کو زیورِ طبع سے آراستہ کر کے منظرِ عام تک پہنچانے کے لئے مجھے انتخاب کیا۔ یہ کنولؔ صاحب کے بڑپّن کا اور مجھ ناچیز پر اعتماد کا ثبوتِ محکم ہے۔

اُستادِ محترم سے میرا پہلا تعارف کسولی کی پُر سکون فضا میں آج سے تقریباً ۲۲۔۲۳ سال پہلے ہُوا اور پھر باتوں باتوں میں اچانک مجھے یہ پتہ چلا کہ آپ بھی سلطان پور لودھی (ریاست کپورتھلہ۔ پنجاب) کے ہیں تو شاید زندگی میں سچی خوشی کا احساس پہلی بار ہوا۔ پھر تو جتنی بار ملاقات ہوئی، ہم قریب سے قریب تر ہوتے گئے۔ ان سے ملتے ہوئے کبھی اپنے چھوٹے پن کا احساس نہیں ہوا۔ یہی ان کے بلند پایہ ہونے کا ثبوت ہے۔ ان سے شعروں پر تو خیر اصلاح لی ہی ہے۔ اِملا تک درست کروایا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اگر اُن دنوں کنولؔ صاحب نے میری رہنمائی نہ کی ہوتی تو شاید میں بھی کچھ الوُل جلوُل تُک بندیوں کی نذر ہو کر خاموش ہو رہتا۔ کنولؔ صاحب نے میرے جذبات سے میرے اندر کے شاعر کو پہچانا۔ میرے شعری شعور کو دیکھا پرکھا اور پھر

اس قدر حوصلہ عطا کیا کہ اب اگر شعر نہ کہوں تو لگتا ہے کہ میں جی نہیں رہا ہوں، صرف سانس لے رہا ہوں۔

میں شخصی طور پر تو جناب کنول صاحب کی تعریف میں جو کچھ بھی کہوں گا کم ہوگا۔ کیونکہ ان میں کوئی بھی بات ایسی نظر نہیں آتی جو قابلِ تعریف نہ ہو۔ کنول صاحب روزمرہ زندگی میں، جسقدر سادگی پسند ہیں۔ طبیعت میں اور فکرِ سخن میں بھی اسی طرح کی سادگی ہے۔ شعر نہایت آسان لب و لہجہ میں نہایت صفائی سے کہہ جاتے ہیں۔ پڑھ سُن کر لگتا ہے کہ یہ بات تو ہر کوئی کہہ سکتا ہے۔ مگر کہنے کی کوشش کرو تو اتنی ہی سادگی سے کہنا آسان نہیں لگتا اور یہی کمالِ فن برسوں کی ریاضت، محنت اور مشق کے بعد ہاتھ آتا ہے۔

شعر دراصل اولاد کی طرح ہوتے ہیں جس طرح نیک اولاد کو دیکھ کر ماں باپ کی شرافت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کلام پڑھ کر اس کے خالق کے بارے میں رائے قائم کی جاسکتی ہے اور کنول صاحب اشعار کے آئینہ میں نہایت سادہ، شائستہ، منکسرالمزاج، انسان دوست، ملنسار، پرخلوص، نیک نیت اور خوش گو نظر آتے ہیں، اور مجموعی طور پر جو تصویر اُبھرتی ہے وہ نہایت خوبصورت، اور جاذبِ نظر شخصیت کی نشاندہی کرتی ہے۔ پاکیزہ خیالات، نزاکتِ مضمون، لطافت، حسنِ معنی، حسنِ بیان، معنی آفرینی، تغزل، ان کے کلام میں جا بہ جا نظر آتے ہیں۔ ان کی سوچ کے سفر میں تخیل اور زبان دوش بدوش دیکھے جا سکتے ہیں۔

جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے کنول صاحب کو کسی پر ناراض ہوتے نہیں دیکھا شاید میں نے ناراضگی کے مواقع دیئے بھی ہوں مگر انہیں کبھی غصہ آتا ہی نہیں حالات سے آدمی اس حد تک سمجھوتہ کر سکتا ہے یہ میری سمجھ سے باہر کی بات ہے

اور شاید میری اسی بات کو دیکھتے ہوئے کنول صاحب نے ۱۹۶۲ء میں میرا تخلص آزاد سے سیماب کر دیا تھا۔

حلقۂ تشنگانِ ادب نئی دلی، جس کی داغ بیل حضرت ساقی لکھنوی صاحب نے ڈالی تھی اور سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے پر دلی کو خیرباد کہہ کر اپنے ہاتھوں حلقہ کی صدارت جنابِ کنول کے سپرد کی اور پھر حلقہ نے جناب کنول صاحب کی صدارت میں اور جناب رگھوناتھ سہائے اُمید کی نظامت میں خوب خوب ترقی کی اور آج یہ حلقہ شعراء و اُدباء میں جس قدر ہر دلعزیز ہے یہ سب انہیں کی سادہ دلی اور خلوص کا صدقہ ہے۔

میری تو سانس سانس یہ تمنا اور پرارتھنا ہے کہ بھگوان انہیں صحت عطا فرمائے اور ان کا دستِ شفقت اسی طرح ہمارے سروں پر بنا رہے۔

آمین!

۱۶/۵/۸۲ سیماب سلطانپوری

سیکرٹری حلقۂ تشنگانِ ادب نئی دلی

جنرل سیکرٹری پنجاب اردو ساہتیہ سنگم نئی دلی

مُصنّف کا تعارف

نام - دیس راج شرما - کنول

مقامِ پیدائش - سلطانپور لودھی (سابقہ ریاست کپورتھلہ) پنجاب

تاریخِ پیدائش - ۵ ر مارچ ۱۹۲۳ء

والدین - پنڈت بنسی لعل (مرحوم) اور شریمتی ایشور کور (مرحوم)

ملازمت - (ریٹائرڈ) اکاؤنٹس آفیسر (ڈیفنس اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ)

تعلیم - ایم۔اے (انگریزی ادب) اور (تواریخ)

رفیقۂ حیات - شریمتی شانتی شرما

بیٹی - منجو شرما - زوجہ شری پی۔سی۔شرما۔ اسسٹنٹ کمانڈنٹ۔ بی۔ایس۔ایف

بھائی - شری مکندلال - جوندلال - نندلال -

پیارے لال اور ہنس راج شرما -

حلقۂ دوست واحباب

ڈاکٹر پی۔این شیشادھری۔ ڈاکٹر پی۔ایس۔سُود۔ جناب کے۔ایس چھابڑہ - جناب شوبھا رام - جناب چمن گپتا - جناب کے۔ایل بھاٹیہ - جناب آر۔جی۔باجپائی - جناب بی۔ایس۔پھول - جناب ٹی۔سی۔جین - جناب نند لال پرؔویزؔ - جناب سنتوکھ رام نگری - جناب رتن پنڈوردی - جناب کے۔کے۔نیرؔ جناب ضیاؔ فتح آبادی - جناب بمل کرشن اشکؔ - جناب راجندر ناتھ رہبرؔ - جناب پرکاش ناتھ پرؔویزؔ - جناب گنگا دھر نسیمؔ - جناب رام کرشن مُضطرؔ - جناب مہدی نظمیؔ - جناب امرناتھ سرشارؔ - جناب رگھوناتھ سہائے امیدؔ - جناب رشی پٹیالوی - جناب جعفر عباس جعفرؔ - جناب طالبؔ چکوالی -

جناب اسکاڈرن لیڈر۔ آر۔بی۔باجپائی

جناب اسکاڈرن لیڈر پی۔کے۔رگھورمن - جناب سکھدیو شرما رشک
جناب خزان چند بسمؔ۔ جناب رادھا کرشن سہگلؔ۔ جناب عبادوید وشِشٹ۔ جناب
کرشن مراری۔ جناب ساغر نظامی۔ جناب بلراج حیرتؔ۔ جناب مظیر ہوشیار پوری
پروفیسر کنول انبالوی۔ جناب مظہر امام۔ جناب راجکمار سوُری ندیمؔ - جناب
اوم پرکاش عارفؔ۔ جناب اوم پرکاش بجاجؔ۔ جناب لام پرکاش راہیؔ
جناب آفتؔ۔ جناب جگدیش جین۔ جناب شِو چرن ضبطؔ۔ جناب کرشن گوپال مغمومؔ
جناب انیس احمد انیسؔ۔ جناب جانباز پانی پتی۔ جناب چمن لال چمنؔ - جناب
اُمادت نادانؔ - جناب ساقیؔ - جناب ظفر ادیبؔ۔ جناب جگدیش مہتہ دردؔ
جناب سیمابؔ بٹالوی۔ جناب برہمانند جلیسؔ اور سیمابؔ سلطان پوری

دو لفظ

زندگی میں بہت کچھ پایا اور بہت کچھ کھویا۔ جو بچ گیا ہے، وہ کتاب کی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔ پسند آجائے تو میں سمجھوں گا کہ میری برسوں کی کاوش بیکار نہیں گئی۔ شاعری مجھے وراثت میں نہیں ملی۔ فقط محبت اور پیار کے طفیل نصیب ہوئی ہے۔ مَیں نے دُنیا اور دنیا والوں سے بے حد محبّت کی ہے۔ نفرت بھول کر بھی کسی سے نہیں کی یہی سبب ہے کہ مجھے بھی زندگی میں پیار ہی پیار ملا ہے۔ میرے دامن میں کس نے کتنا پیار بھرا ہے۔ مجھے اس کا احساس ہے۔ ان کی یاد آج بھی میرے دل میں موجود ہے۔ مَیں اُن کے پیار کا مول چُکا نہیں سکتا۔

۵ مارچ ۱۹۲۳ء کو سلطانپور لودھی (سابقہ ریاست کپورتھلہ) میں پیدا ہوا۔ والدِ محترم کا سایہ بچپن ہی سے سر سے اٹھ گیا تھا۔ بڑے بھائیوں اور ماں کی شفقت نے زندہ رکھا۔ مَیں زندگی سے بالکل مطمئن ہوں۔ مجھے اس سے کوئی شکوہ یا شکایت نہیں ہے۔ جیسا کہ میں نے ایک شعر میں کہا بھی ہے:-

زندگی سے کیا شکایت کیجئے۔ جس طرح بھی کٹ رہی ہے، ٹھیک ہے

میری ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۴۲ء میں ہوا۔ تب میں لاہور (پاکستان) میں تھا۔ گیت، افسانے اور ڈرامے لکھے۔ پھر توجہ نظموں اور غزلوں پہ آکر ٹھہر گئی۔ شملہ اور کسولی کی رنگین فضاؤں نے میرے شعروں میں رنگینیاں بھر دیں۔ دہلی میں حلقۂ تشنگانِ ادب نئی دلّی کی نشستوں اور ادبی سرگرمیوں نے میرے ذوقِ شاعری کو اور بھی نکھارا۔ اور یہیں میری ملاقات ہندوستان کے کچھ ممتاز اور بیدار مغز

شعراء حضرات سے لکھی ہوئی۔ جن میں جناب ساغر نظامی۔ جناب مہدی نظمی جناب شمیم کرہانی (مرحوم)۔ جناب ضیا فتح آبادی اور جناب جاوید وششٹ کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

جن دوستوں نے شاعری اور اس مجموعے کی اشاعت کے سلسلے میں مجھے گاہے گاہے نہایت قیمتی اور مفید مشوروں سے نوازا ہے۔ وہ ہیں جناب بمل کرشن اشک۔ جناب اوم پرکاش عادت۔ جناب دیا کشن رہبر اور برہمانند جلیس۔ میں ان کا بے حد شکر گزار ہوں۔

میرے شاگردِ عزیز سیماب سلطانپوری بے حد ذہین، قابل اور پُرگو شاعر ہیں۔ مجھے ان پر بے حد ناز ہے۔

اس مجموعے کی اشاعت کا پورا بوجھ جناب جلیس اور سیماب سلطانپوری کے جوان اور مضبوط کندھوں نے سنبھالا ہے۔

میں نے سلیس زبان اور آسان الفاظ میں سیدھے سادے اشعار کہے ہیں۔ مگر دِل کی گہرائیوں سے کہے ہیں۔ اگر اُن میں کوئی ادبی یا فنّی خامی رہ گئی ہو تو براہِ کرم اُسے نظر انداز کر دیجئے۔

دیس راج۔ کنول
ایم اے

19-4-82

غزلیں

کل صبح ایک شاخ پہ دو اَدھ کِھلے گلاب
تھوڑا سا مُسکرا کے بہت سوچتے رہے

نور ہی نور ہے ظلمات کے آئینے میں
رقص کرتی ہے سحر رات کے آئینے میں
تھک گئیں ڈھونڈھ کے جب آپکو میری نظریں
مل گئے آپ خیالات کے آئینے میں
جب بھی مانگا ہے کبھی اپنی وفاؤں کا صلہ
اُن کو پایا ہے سوالات کے آئینے میں
یاد مہکی جو تری رات کی رانی بن کر
کھل اُٹھے پھول سے جذبات کے آئینے میں
آ گرا وقت کے پانی میں کہاں سے کنکر
ایک ہلچل سی ہے حالات کے آئینے میں
دیکھ لیتا ہوں میں ہر روز ہزاروں چہرے
اپنے گذرے ہوئے لمحات کے آئینے میں
کیا ہُوا شام دھواں بنکے جو آئی ہے کنولؔ
چاند اُبھرے گا ابھی رات کے آئینے میں

نکلے ہیں آج لے کے تری جستجو کے پھول
ہر گام پر کھلیں گے نئی آرزو کے پھول

کھلتے ہیں جب گلاب تو یہ سوچتا ہوں میں
یہ کون بو گیا ہے زمیں میں لہو کے پھول

اک داستانِ غم کی امانت ہیں دوستو
بکھرے پڑے زمیں پہ کسی خوبرو کے پھول

یہ کون میکدے سے گیا ہے اُداس اُداس
مُرجھا کے رہ گئے ہیں یہ جام وسبو کے پھول

تجھ سے ملے ہوئے تو زمانے ہوئے مگر
تازہ ہیں آج تک بھی تری گفتگو کے پھول

بے شک ہمیں یقین ہے اے مادرِ وطن
مہکیں گے تا ابد یہ تری آبرو کے پھول

خوشبو سی اٹھ رہی ہے ہر اک سمت اے کنول
شاید کہ کھل اُٹھے ہیں تری آرزو کے پھول

دُنیا سے دل لگا کے بہت سوچتے رہے
کانٹوں کو گُدگُدا کے بہت سوچتے رہے

کل صبح ایک شاخ پہ دو اَدھ کِھلے گلاب
تھوڑا سا مُسکرا کے بہت سوچتے رہے

کیا جانے چاندنی نے ستاروں سے کیا کہا
شب بھر وہ سر جھکا کے بہت سوچتے رہے

ٹوٹا کہیں جو شاخ سے غنچہ تو ہم وہیں
پہلو میں دِل دبا کے بہت سوچتے رہے

کیا جانے کس لئے وہ نظر کے سوال پر
ہم سے نظر بچا کے بہت سوچتے رہے

اِتنا تو یاد ہے کہ محبّت کے ذکر پر
ہونٹوں کو وہ دَبا کے بہت سوچتے رہے

ہاتھوں سے گِر کے چُور ہوا جام جب کنولؔ
ٹکڑے اُٹھا اُٹھا کے بہت سوچتے رہے

دُنیا پتھّر پھینک رہی ہے جھنجلا کر فرزانوں پر
اَب وہ کیا اِلزام دھرےگی ہم جیسے دیوانوں پہ

دل کی کلیاں افسردہ سی، ہر چہرہ مایوس مگر
باغ مہکتے دیکھ رہا ہوں گھاٹوں پر، شمشانوں پر

پتھّر دل ہیں لوگ یہاں کے، یہ پتّھر کیا پگھلیں گے
کس لئے بارش ہوتے دیکھی تپتے ریگستانوں پہ

جن کی ایک نظر کے بدلے ہم نے دُنیا ٹھکرا دی
نام ہمارا سُن کر رکھیں ہاتھ وہ اپنے کانوں پر

آہیں آنسو پیش کئے تو جانے کیوں منہ پھیر لیا
اُن کو شاید غصّہ آیا میرے ان نذرانوں پر

کیا تقدیر کا شکوہ یارو اپنی اپنی قسمت ہے
اپنا ہاتھ گیا ہے اکثر ٹوٹے سے پیمانوں پر

آج کنول ہم کچھ بھی کہہ لیں بات مگر یہ سچّی ہے
آج کا اِک اِک پل بھاری ہے پچھلے کئی زمانوں پر

آنکھوں سے کوئی میرے حسیں خواب لے گیا
یعنی تمام حلقۂ احباب لے گیا

چھیڑا ہی تھا ستار پہ اِک نغمۂ حیات
ہاتھوں سے وقت چھین کے مضراب لے گیا

آنسو کی ایک بوند کلیجہ نِگل گئی
پتھر کو ایک قطرۂ سیماب لے گیا

دل کی کتاب لوٹنے والا بھی خوب تھا
دلچسپ جو تھا سب سے وہی باب لے گیا

جل بجھ کے رہ گیا ہے ہر اک یاد کا چراغ
چُن چُن کے وقت گوہرِ نایاب لے گیا

ہر گام پر لگی تھی یہاں رہزنوں کی بھیڑ
جس کے لگا جو ہاتھ وہ اسباب لے گیا

قاتل کے رُوپ میں وہ کشش تھی کہ اے کنولؔ
مقتل میں مجھ کو پھر دلِ بےتاب لے گیا

نظروں کے گرد یوں تو کوئی دائرہ نہ تھا
اپنے سوائے کچھ بھی مگر سوجھتا نہ تھا

وہ جس نے زندگی کا مری رُخ بدل دیا
وہ آپ تھے حضور کوئی دُوسرا نہ تھا

کیا جانے کس خیال سے چپ ہو کے رہ گیا
ایسا نہیں کہ غم مجھے پہچانتا نہ تھا

ہونٹوں کے پاس آ نہ سکا جام عمر بھر
حالانکہ فاصلہ یہ، کوئی فاصلہ نہ تھا

پوچھی کسی نے راہ تو چُپ ہو کے رہ گئے
کہتے بھی کیا کہ خود ہمیں اپنا پتہ نہ تھا

ہر شخص لگ رہا تھا ہمیں پارسا مگر
دیکھا قریب سے تو کوئی پارسا نہ تھا

اب کے کنول بہار بھی آئی تو اس طرح
سارے چمن میں ایک بھی پتا ہرا نہ تھا

ہم صدا کرتے رہے در پہ فقیروں کی طرح
زندگی پھر بھی پسیجی نہ امیروں کی طرح

قید جسموں میں یہی سوچتی ہونگی رُوحیں
ہم بھی اک روز رہا ہونگی اسیرونکی طرح

اور پیچیدہ ہوئی جاتی ہے راہِ منزل
اپنے ہی ہاتھ کی اُلجھی سی لکیروں کی طرح

کس نے پلکوں پہ مرے ٹانک دِئے ہیں آنسو
ایک دلہن کی کلائی پہ کلیروں کی طرح

یہ محبّت ہے، محبّت میں سیاست کیسی
آپ بھی ملنے لگے ہم سے سفیروں کی طرح

اپنے اعمال پہ نازاں تو نہیں ہیں اَے دوست
ہم پشیماں ہیں گنہگار ضمیرونکی طرح

تم جو آئے تو خیالوں میں کنوَل جاگ اُٹھے
نیلگوں آب پہ ہنستے سے جزیروں کی طرح

کاندھوں پہ زندگی کی صلیبیں لئے ہوئے
غم پھر رہے ہیں میرا پتہ پوچھتے ہوئے

رہبر بھی، راہزن بھی ہیں لوگوں کی بھیڑ میں
آؤ چلیں اِدھر سے اُدھر دیکھتے ہوئے

ہو آئے جب غرور کبھی خود پہ آپ کو
سورج کو دیکھ لینا کہیں ڈوبتے ہوئے

پہلی سی انجمن میں رہی بات اب کہاں
جی ڈر رہا ہے اَب تو یہاں بولتے ہوئے

افسوس کاٹ دی ہے یونہی زندگی تمام
دنیا سے جا رہے ہیں یہی سوچتے ہوئے

آخر یہیں ملے گا تمہیں دل کے آس پاس
صدیوں سے پھر رہے ہو جسے ڈھونڈتے ہوئے

لو وہ بھی کہہ رہے ہیں کنول بے وفا مجھے
گذری ہے ایک عمر جنہیں پوجتے ہوئے

ہیں مقدّر میں ابھی کرب کے منظر کتنے
اور اُتریں گے ابھی سینے میں خنجر کتنے

کوئی گورکھ ہی بتائے تو بتائے شاید
بھیس بدلے ہوئے پھرتے ہیں مچھندر کتنے

کیا خبر دُور ابھی اور ہے کتنی منزل
کیا بتائیں ہیں ابھی پاؤں میں چکّر کتنے

شیش محلوں سے شب و روز گذرنے والو
ان پہ مارو گے ابھی تان کے پتھّر کتنے

کون ٹھہرا ہے زمانے میں ہمیشہ اے دوست
چل دیئے آکے زمانے سے سکندر کتنے

اپنی اک چاند سی دلہن کو منانے کیلئے
"رات بھر روپ بدلتا ہے سمندر کتنے"

ہیں سبھی ایک سے اب کون بتائے ان میں
کتنے گوہر ہیں، کنول اور ہیں کنکر کتنے

جنوں نے تن پہ سجایا ہے بیخودی کا لباس
سنور گیا ہے پہن کر یہ سادگی کا لباس

وفا کا اور بھی چہرہ نکھر نکھر جائے
اُتار پھینکیں اگر لوگ دوستی کا لباس

سوائے غم کے مرے پاس کچھ نہیں باقی
کہاں سے لاؤں تمہارے لئے خوشی کا لباس

انہیں ہیں آپ کو شاید ملیں فرشتے بھی
پہن کے بیٹھے ہیں جو لوگ آدمی کا لباس

کہاں پہ ڈھونڈتے پھرتے ہو روشنی یارو
یہ روشنی ہی تو پہنے ہے تیرگی کا لباس

سمٹ کے آپ ہی منزل قریب آ جائے
اتار پھینکیں، اگر لوگ رہبری کا لباس

کنولؔ یہ سچ ہے یہاں موت کی حسیں دُلہن
پہن کے آتی ہے ہر بار زندگی کا لباس

رات دو رات کا بسیرا ہے
زندگی جوگیوں کا پھیرا ہے
بجھ گیا چاند سو گئے تارے
دُور کتنا ابھی سویرا ہے
عمر بھر ناچتا نچاتا ہے
غم بھی گویا کوئی سپیرا ہے
وقت کی سادگی پہ مت جاؤ
وقت سب سے بڑا لُٹیرا ہے
روشنی چھن رہی ہے ہر جانب
پھر بھی ہر راستہ اندھیرا ہے
جام کا سلسلہ دراز رہے
میکدہ زندگی کا ڈیرا ہے
دل پہ گذرے جو حادثات کنول
ان کو اشعار میں بکھیرا ہے

اِک دن ہنس کر بول اٹھی یوں میرے پاؤں تلے کی مٹّی
میں بھی اِک دن تم جیسی تھی چنچل چلتی پھرتی مٹّی
یہ مدماتے، ہنستے چہرے، یہ چنچل کجرارای آنکھیں
آنکھ مچولی کھیل رہی ہے۔ کیا جانے کس کس کی مٹّی
ہنستے گاتے گیت خوشی کے، یہ ساغر، یہ مے کے پیالے
ان کے پیچھے جھانک رہی ہے دیکھو رنگ رنگی مٹّی
ناحق سن کر جھوم رہے ہو، عشق و محبت کے افسانے
ان پر جم کر رہ جائے گی اِک دن اچھی خاصی مٹّی
آئے گا کس کام تکبّر، چھوڑو یہ بے کار کی باتیں
مٹّی تو پھر مٹّی ٹھہری، کیا کالی کیا گوری مٹّی
دل پر ٹھیس لگانے والو، ٹوٹ گیا تو پچھتاؤگے
آنسو بن کر بہہ جائے گی، ان آنکھوں سے گیلی مٹّی
جب پت جھڑ کا ظالم گلچیں پھول کنول کا لے جائیگا
برسوں اس کو یاد کریگی۔ اس گلشن کی سوندھی مٹّی

ہر دل کے آس پاس ہے اِک غم چھپا ہُوا
ہر پھول کے قریب ہے کانٹا اُگا ہُوا

اَب دوستی کریں بھی تو کیا زندگی کے ساتھ
ہر دم اُسے ہے موت کا کھٹکا لگا ہُوا

یُوں دِل میں رہ گئی ہے کسی بیوفا کی یاد
رہ جائے جیسے گھر میں کوئی در کھلا ہُوا

جھوٹی تسلّیوں سے نہ بہلاؤ اب مجھے
پہلے بھی ہے کسی سے یہ نغمہ سُنا ہُوا

لپٹی ہوئی بشر سے ہے اُمید اس طرح
سینے سے جیسے ماں کے ہو بچّہ لگا ہُوا

پلکوں پہ اَشک ہیں یا کوئی کارواں کہیں
منزل کے پاس آ کے اچانک رُکا ہُوا

ملتی ہے اب جہاں میں وفا اس طرح کنول
جیسے کہیں پہ راہ میں سِکّہ گرا ہُوا

کہنے کو ہر قدم پہ اُجالوں کا جال ہے
پھر بھی وہ تیرگی ہے کہ چلنا مُحال ہے

دِل کا معاملہ نہ جگر کا سوال ہے
دَورِ جنوں میں جان کا بچنا مُحال ہے

وُہ آئینہ بھی دیکھتے جاتے ہیں ساتھ ساتھ
کہتے بھی جا رہے ہیں کہ واللہ کمال ہے

مائل بہ التفات انہیں پا رہا ہوں میں
اس میں بھی لگ رہا ہے زمانے کی چال ہے

جس کا جواب دے نہ سکی موت کی خمی
یہ زندگی وہ ایک سُلگتا سوال ہے

اب رہبروں کے بس کی کہاں رہ گئی ہے بات
منزل سے پوچھ لیں گے ترا کیا خیال ہے

قائم ہمارے دم سے کنول ہے وقارِ عشق
ہر شئے کو اس جہاں میں دگرنہ زوال ہے

جلوے جو محوِ رقص تھے ان کی نگاہ میں
تاروں میں ڈھل گئے ہیں کبھی مہر و ماہ میں

خود ہنس پڑے ہیں اپنے ہی حالِ تباہ پر
اکثر ہوا ہے یوں بھی محبّت کی راہ میں

جس کو ترس رہے ہیں مرے لب مری زباں
وہ بات کہہ گیا ہے کوئی اِک نگاہ میں

ویسے تو کٹ ہی جاتی ہے ہر زندگی اے دوست
جینے کا لطف آتا ہے لیکن نباہ میں

سائل وہی ہیں، ان کی مرادیں وہی مگر
وُہ بات اَب کہاں ہے تری بارگاہ میں

کچھ اَور ہو گئی ہے سوا، تلخئ حیات
اِک طنز رہ گیا ہے زمانے کی واہ میں

تہذیبِ نَو کی کونسی منزل ہے یہ کنولؔ
اِک لطف پا رہا ہے بشر ہر گناہ میں

جو گھر کے آتے ہیں بادل برس نہ جائیں گے
سوئے چمن سے وہ سوئے قفس نہ جائینگے

کھلا رہے ہو امیدوں کی شاخ پر لیکن
کڑی ہے دھوپ یہ غنچے جھلس نہ جائینگے

نجات مل بھی گئی موت سے تو کیا کہ ہم
غمِ حیات کی باہوں میں کس نہ جائیں گے

یہی رہی جو تری طرزِ بے رُخی اے دوست
ہم التفات کو تیرے ترس نہ جائینگے

یہ سوچ کر ہی تو جینے کو دل نہیں کرتا
غموں کے ناگ ہمیں آ کے ڈس نہ جائینگے

اُجڑ نہ جائے گا کل تک یہ میکدہ ساقی
ہم ایک بوند کو کل تک ترس نہ جائینگے

چلا تو جاؤں کنول اُن سے دُور میں لیکن
وہ آ کے میرے خیالوں میں بس نہ جائینگے

پھول ہے نہ خوشبو ہے چاندنی نہ شبنم ہے
زندگی حقیقت میں حادثوں کا سنگم ہے

آپ ہی بتائیں اب، کونسا یہ عالم ہے
دوستی کے ہاتھوں میں دشمنی کا پرچم ہے

سوچتا ہوں اکثر میں، عالمِ تذبذب میں
آدمی نہ جانے کیوں آدمی سے برہم ہے"

پھیلتے اندھیروں میں، لے رُخی کے جھونکوں سے
آجکل وفاؤں کا ہر چراغ مدّھم ہے

آدمی تو بستے ہیں اَن گنت یہاں لیکن
کوئی دورِ حاضر میں، رام ہے نہ گوتم ہے

دیکھ کر بھی جیسے وہ دیکھتے نہیں مجھ کو
پیار کا وہ اِک رشتہ آج تک بھی قائم ہے

موت سے کنولؔ مجھکو خوف ہو تو کیونکر ہو
موت عارضی ٹھہری زندگی تو پیہم ہے

یوں نہ دِل سوگوار کرتا جا
اِنتظارِ بہار کرتا جا

کروٹیں لے رہی ہے رات ابھی
صُبح کا انتظار کرتا جا

کِس نے دیکھی ہے صورتِ فردا
آج کا اِعتبار کرتا جا

کون سُنتا ہے داستاں غم کی
ایک چُپ اختیار کرتا جا

یہ بھی اِک بندگی کی صورت ہے
اُس کے بندوں سے پیار کرتا جا

ہے اگر آرزوئے وصلِ یار
دل کبھی جاں نثار کرتا جا

پھر مِلا زندگی سے ہاتھ کنول
موت کو شرمسار کرتا جا

اِس زندگی کی راہ سے لاکھوں بشر گئے
آئے تھے وہ کدھر سے، نہ جانے کِدھر گئے

اَپنے پہ ہنس رہا ہوں زمانے کے ساتھ ساتھ
وَیسے تو مُسکرائے زمانے گزر گئے

اَپنے کئے پہ اب وہ پشیماں ہوئے تو کیا
دامن مرا تو آکے وہ اشکوں سے بھر گئے

یں کیا ہوں راہِ عشق میں میری بساط کیا
اس راہ میں سُنا ہے کہ لاکھوں کے سر گئے

دَرویش جیسے کوئی گزرتا ہے شہر سے
ہم زندگی کی راہ سے اَیسے گزر گئے

اَب معجزہ کہیں یا اسے حادثہ کہیں
گیسو کسی کے رخ پہ بکھر کر سنور گئے "

ملنے کی اُن سے ایک ہی صُورت تھی اَے کنول
ہم خاک بن کے راہ میں ان کی بکھر گئے

آنکھوں سے ہو کے دِل میں وہ صورت اُتر گئی
ممکن نہ تھی جو بات وہی بات کر گئی

کیا جانے کیا وہ غم تھا جو ہر دل کو چھُو گیا
جو آنکھ بھی گئی تری محفل سے تر گئی

میرا ہی آشیاں تھا گریں جس پہ بجلیاں
میری ہی خاک تھی جو ہوا میں بکھر گئی

ٹکتی نہ تھی کِسی پہ زمانے میں آج تک
"دیکھا تمہیں تو پھر نہ کسی پر نظر گئی"

جاتے ہوئے جہاں سے یہی سوچتے ہیں لوگ
ہائے وہ زندگی، وہ جوانی کِدھر گئی

دامن چھڑا کے آپ چلے تو گئے مگر
ہم کیا کہیں، جو دل پہ ہمارے گزر گئی

روئے شبِ فراق ہم اتنا کہ اے کنول
دامن نچوڑتی ہوئی اپنا سحر گئی

کس نے دیکھا میری جانب وادیٔ گلزار سے
دُھل گئی ہے گرد جیسے وقت کے رُخسار سے

وقت کی دیوار پر وہ نقش ہو جاتے ہیں لوگ
لَوٹ کر آتے نہیں جو کوچۂ دلدار سے

بخش دو، یہ ناسمجھ ہیں، ہر خطا ان کی معاف
کہہ گیا تھا یہ مسیحا وقتِ رخصت دار سے

پھول کی پتّی سے نکلے ہیں کبھی کانٹے حضور
خار ہیں یہ دیکھئے نکلیں گے نوکِ خار سے

کیا خبر ہے پیار کی یہ کونسی منزل ابھی
"گفتگو کرتا ہوں اکثر میں در و دیوار سے"

سُوئے صحرا آ تو نکلے آج دیوانے مگر
اَب کہاں جائیں گے وہ سر پھوڑنے دیوار سے

غم تو یہ ہے اس جہاں میں دل نہیں بکتے کنول
ہم بھی لے آتے وگرنہ ایک دو بازار سے

کبھی دوستی کی باتیں، کبھی دشمنی کی باتیں
وہی زندگی ہے یارو، وہی زندگی کی باتیں
وہی رہبروں کے جمگھٹ، وہی بھیڑ رہزنوں کی
وہی کارواں ہیں غم کے، وہی گمرہی کی باتیں
کبھی چھیڑ اے مغنّی! کوئی کیف زا ترانہ
میں ازل سے سُن رہا ہوں غمِ عاشقی کی باتیں
کبھی جس میں ہم ملے تھے، غمِ زندگی بھلا کر
چلو آج پھر کریں ہم، اسی چاندنی کی باتیں
نئے دور میں ابھی تک وہی سلسلہ ہے جاری
وہی ذکرِ جام و مینا۔ وہی شیخ جی کی باتیں
مجھے دیکھ کر وہ بولے۔ بڑی عمر آپ کی ہے
سبھی لوگ کر رہے تھے ابھی آپ ہی کی باتیں
جسے ڈھونڈتی ہے دنیا۔ جسے ڈھونڈتے ہیں انساں
چلو اے کنول کریں پھر اسی روشنی کی باتیں

موجِ طوفاں سے سفینوں کو صدا دیتے رہو
ہے قریں منزل یہ کہہ کر حوصلہ دیتے رہو
ہر گھڑی مجھ کو نہ جینے کی دعا دیتے رہو
اور جو بھی جی میں آئے وہ سزا دیتے رہو
رُک گیا تو لے اُڑیگی موت کی آندھی اِسے
"زندگی کے کارواں کو راستہ دیتے رہو"
لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں آپکے دِل کا پتہ
ہو سکے تو خود بجھے میرا پتہ دیتے رہو
ہر جفا پر داد دِی ہے دیکھئے ہم نے تمہیں
تم بھی بھولے سے کبھی دادِ وفا دیتے رہو
لوگ جو مغرور ہیں دنیا میں اپنے حُسن پر
وقت کا ہاتھوں میں ان کے آئینہ دیتے رہو
کیا ہوا جو ساری دنیا بیوفا ہے اَے کنول
تم محبّت کا محبت سے صِلہ دیتے رہو

پھول جو صحنِ بیاباں میں جواں ہوتا ہے
عظمتِ فصلِ بہاراں کا نشاں ہوتا ہے
قطرۂ اشک کو سمجھو نہ ذرا سا پانی
قطرۂ اشک غمِ دل کی زباں ہوتا ہے
ہیں یہ بےکار سبھی دیر و حرم کے جھگڑے
لامکاں ہو جو کہیں اس کا مکاں ہوتا ہے
جب بھی آتی ہے کبھی فصلِ بہاراں اے دوست
آس پاس اس کے کہیں دورِ خزاں ہوتا ہے
جانے کیا سوچ کے ہو جاتا ہوں میں بھی غمگیں
جب بھی محفل میں کبھی ذکرِ بتاں ہوتا ہے
آج کے دور میں انسان نہ ڈھونڈو یارو
آج کے دور میں انسان کہاں ہوتا ہے
اپنی تہذیب کی یہ آخری منزل ہے کنول
ریگزاروں پہ بہاروں کا گماں ہوتا ہے

میں تو ایک مُشتِ غبار ہوں مری زندگی سے نہ کھیلیئے
میں ہوں اِک چراغ سحر یہاں مری روشنی سے نہ کھیلیئے
جو دیئے ہیں آپ نے غم مجھے کبھی سر پہ آنکھوں پہ رکھ لئے
مگر آپ بھی تو کبھی کبھی مری ہر خوشی سے نہ کھیلیئے
ہے ہزار جنموں کی پیاس یہ نہ بجھے گی ایک دو گھونٹ سے
مجھے ایک جام نہ دیجیئے مری تشنگی سے نہ کھیلیئے
مجھے آزما کے تو دیکھیئے مجھے آپ جاں سے عزیز ہیں
جو بھی آئے جی میں کریں مگر مری دوستی سے نہ کھیلیئے
مری ہر وفا کے جواب میں یہ جو کر رہے ہو عنایتیں
میں کہوں گا آپ سے پھر یہی مری سادگی سے نہ کھیلیئے
ہے سکون دل کی جو آرزو تو نہ دِل کسی سے لگایئے
غمِ عاشقی ہے بُری بلا غمِ عاشقی سے نہ کھیلیئے
ہے کنول بجا کہ یہ زندگی غم و یاس سے ہے بھری مگر
ہے مزے کا کھیل یہ زیست کا اِسے بے دلی سے نہ کھیلیئے

جو صلے دن کے کبھی شام سے آگے نہ بڑھے
ہم کبھی گردشِ ایام سے آگے نہ بڑھے
عقلِ انسان تو پہنچی ہے خلاؤں لیکن
آدمی پھر بھی رہِ عام سے آگے نہ بڑھے
تلخیٔ زیست ہے کیا چیز یہ ان سے پوچھو
جو کبھی حلقۂ آلام سے آگے نہ بڑھے
شرط اِک یہ بھی ہے جینے کی زمانے والو
زندگی موت کے الزام سے آگے نہ بڑھے
کر گئے آئی گئی بات تری اُسے واعظ
رند تھے رند، مے و جام سے آگے نہ بڑھے
یوں تو رنگین تھے غیروں کے فسانے لیکن
ہم ترے نامہ و پیغام سے آگے نہ بڑھے
جس کے آتے ہی کنولؔ ہوش کو غش آجائے
ہم اسی موڑ، اُسی گام سے آگے نہ بڑھے

جینے کی آج مجھ کو دعا دے رہے ہیں لوگ
آخر یہ کس خطا کی سزا دے رہے ہیں لوگ

میری کہانیوں کو ہوا دے رہے ہیں لوگ
گویا مری وفا کا صلہ دے رہے ہیں لوگ

ہر بار ایک زخم نیا دے رہے ہیں لوگ
جو کچھ بھی دے رہے ہیں بجا دے رہے ہیں لوگ

جب آشیاں نہ تھا تو سبھی لب بہ مُہر تھے
اب بجلیوں کو میرا پتہ دے رہے ہیں لوگ

ساحل کے پاس لا کے ڈبویا ہے موج نے
لیکن دغا کا نام دغا دے رہے ہیں لوگ

یہ داد کم نہیں کہ مری ہر شکست پر
ہر بار مرحبا کی صدا دے رہے ہیں لوگ

پانی میں رکھ دیا ہے جلا کر مجھے کنول
اپنی طرف سے مجھکو ضیا دے رہے ہیں لوگ

دل میں جگر میں یاس کا پیکاں لئے ہوئے
ہم جی رہے ہیں زیست کا ارماں لئے ہوئے

آہ و فغاں و نالہ و فریاد و رنج و غم
اک دل ہے اپنا سینکڑوں عنواں لئے ہوئے

بیوہ سی گھومتی ہیں زمانے میں حسرتیں
ہر آرزو ہے دیدۂ گریاں لئے ہوئے

افسانۂ حیات مکمل نہ ہو سکا
ہر حادثہ ہے طولِ بیاباں لئے ہوئے

ناکامیِ حیات سے ڈرتے نہیں ہیں ہم
پھرتے ہیں ساتھ گردشِ دوراں لئے ہوئے

پھولوں کا بانکپن ہی نہیں حاصلِ بہار
کانٹے بھی ہیں غرورِ گلستاں لئے ہوئے

آؤ کہ خیر مانگیں سفینوں کی اے کنول
ہر موج ہے ارادۂ طوفاں لئے ہوئے

پیدا دلوں میں پیار کے ارماں ہوئے تو ہیں
آثار زندگی کے نمایاں ہوئے تو ہیں
کچھ گلبدن چمن میں خراماں ہوئے تو ہیں
آباد پھر سُنا ہے گلُستاں ہوئے تو ہیں
یہ کہہ رہی ہیں ان کی مُسلسل نوازشیں
اپنے کئے پہ اب وہ پشیماں ہوئے تو ہیں
آؤ کہ ہم بھی مل کے لکھیں کچھ کہانیاں
رنگیں غمِ حیات کے عنواں ہوئے تو ہیں
لے جائیگی کہیں نہ کہیں کشتیِ حیات
اب ہمسفر ہمارے یہ طوفاں ہوئے تو ہیں
دل کہہ رہا ہے دُور نہیں موسمِ بہار
گلشن میں عندلیب غزلخواں ہوئے تو ہیں
اب دیکھنا ہے ہم پہ گذرتی ہے کیا کنول
اہلِ خرد جنوں کے نگہباں ہوئے تو ہیں

منزل دکھائی دے نہ کوئی راستہ مجھے
لے آئے ہیں کہاں پہ مرے رہنما مجھے

اے وقت پھر سے دینا ذرا آئینہ مجھے
"حیرت سے تک رہا ہے جہانِ وفا مجھے"

شکوہ رہا کسی سے نہ کوئی گلہ مجھے
تم مل گئے تو سارا جہاں مل گیا مجھے

مَیں سو چلا تھا اپنے تکبّر کی چھاؤں میں
اچھّا ہوا جو آپ نے چونکا دیا مجھے

کیسے کروں میں دل سے جُدا اب متاعِ غم
لے دے کے اک اسی کا تو ہے آسرا مجھے

دنیا میں ہر قدم پہ نگاہوں کی بھیڑ تھی
رہ رہ کے یاد آیا ترا دیکھنا مجھے

اِک پیار کی نظر سے یونہی دیکھکر کنولؔ
پھر غم سے کر گیا ہے کوئی آشنا مجھے

ختم غم کا سلسلہ تو عمر بھر ہوتا نہیں
ہم چلے جاتے ہیں لیکن سفر ہوتا نہیں
دل نہیں جلتا کہ چھلنی اب جگر ہوتا نہیں
یہ تماشا کب یہاں شام و سحر ہوتا نہیں
بھر نہ آئے آنکھ جس کی دوسرے کے درد سے
ہو بھلے کچھ اور لیکن وہ بشر ہوتا نہیں
ایک پل بکتی نہیں دنیا میں خوشیوں کی صدی
درد کا اک پل بھی لیکن مختصر ہوتا نہیں
ساری دنیا گھوم کر بھی ہم نے یہ دیکھا یہاں
اپنے گھر سے اور بہتر کوئی گھر ہوتا نہیں
ہم نے دیکھا ہے پگھلتے پتھروں کو اے کنول
کون کہتا ہے دعاؤں میں اثر ہوتا نہیں

سَو سَو طرح کے آج وہ وہم و گماں کہاں
پہلی سی بات اُنکے مرے درمیاں کہاں

اِک اِک سے پوچھتا ہوں کہ برقِ ستم شعار
پھر لے اڑی ہے آج مرا آشیاں کہاں

ان تیرہ بختیوں کو اُجالے نہ بخشیئے
لائے گا ان کی تاب دلِ ناتواں کہاں

دائم نہیں ہے جب یہ بہاروں کی زندگی
پھر مستقل رہے گا یہ دورِ خزاں کہاں

منزل کو آج تک بھی ہے خود جس کا اِنتظار
گُم ہو کے رہ گیا ہے وہی کارواں کہاں

فکرِ سخن تو آج بھی کرتے ہیں ہم مگر
غالبؔ سی اور میرؔ سی طرزِ بیاں کہاں

دُھندلا دیا ہے وقت نے شاید انہیں کنولؔ
آدم کی عظمتوں کے رہے اب نشاں کہاں

سدا کھلتے ہیں شاخوں پر گلاب آہستہ آہستہ
کسی کمسن پہ آتا ہے شباب آہستہ آہستہ

بہت دلچسپ ہے ہر باب اسکا ہر ورق رنگیں
پڑھو بے شک، مگر دل کی کتاب آہستہ آہستہ

گلہ جب خط نہ لکھنے کا کبھی کردوں تو کہتے ہیں
لکھیں گے آپ کے خط کا جواب آہستہ آہستہ

وفاؤں اور جفاؤں کی مجھے گنتی نہیں آتی
چکا دوں گا کبھی یہ بھی حساب آہستہ آہستہ

وہ کہتے ہیں محبت کا اثر اُن پر نہیں ہوگا
میں کہتا ہوں اجی ہوگا جناب آہستہ آہستہ

کسی کی مست آنکھوں سے کنول کل شب جو پی لی تھی
وہ اترے گی ترے سر سے شراب آہستہ آہستہ

○

جب موسم بھیگا ہوتا ہے
پھول بکف کانٹا ہوتا ہے
پھیلے تو اک آگ کا دریا
اک آنسو کتنا ہوتا ہے
پردہ ہے بس آنکھ کا پردا
اور تو پردہ سا ہوتا ہے
دل خوش ہو تو اے دیوانے
ہر موسم اچھا ہوتا ہے
دل روتا ہے رو لینے دو
اس سے غم ہلکا ہوتا ہے
آخر غم نے آنسو پونچھے
"اپنا پھر اپنا ہوتا ہے"
لہر دل میں بھی پھول کنول کا
ساگر سا ٹھہرا ہوتا ہے

قصّۂ مختصر بھی ہے، لمبی سی داستاں بھی ہے
نام ہے جس کا زندگی آگ بھی ہے دھُواں بھی ہے

دونوں پہ حادثات تو گذرے تھے ایک سے مگر
"حسُن کی کچھ نہ پوچھیئے عشق تو شادماں بھی ہے"

اس بتِ دلفریب کی شوخی تو دیکھیئے ذرا
دیکھو تو مہرباں لگے ویسے وہ بدگماں بھی ہے

جاتے ہوئے گلوں نے یہ صحنِ چمن سے دی صدا
دامنِ ہر بہار سے لپٹی ہوئی خزاں بھی ہے

سمجھا نہ آج تک کوئی شانِ خدا تو دیکھیئے
ہے بھی مکیں وہ ہر جگہ ویسے وہ لامکاں بھی ہے

برسوں پہ منحصر نہیں، دِل کا ہے سب معاملہ
دل کی نظر سے آدمی پیر بھی ہے جواں بھی ہے

دیر و حرم سے کم نہیں بزمِ سخن بھی اے کنول
ذکرِ بُتاں یہاں بھی ہے ذکرِ بُتاں وہاں بھی ہے

مانگ ہر غم کے اندھیرے کی سجائے رکھنا
آج کی رات کو دُلہن سی بنائے رکھنا
ٹوُٹنے پائے نہ اس رات کے عالم کا فسوُں
تا سحر اپنے چراغوں کو جلائے رکھنا
ہیں بہت تند زمانے کی ہوائیں اے دوست
دِل کے دامن میں چراغوں کو چھپائے رکھنا
روشنی آپ کی نظروں سے ملے گی ان کو
اِن چراغوں سے نظر اپنی مِلائے رکھنا
میں بھی چُپ چاپ ستاروں سے کرونگا باتیں
دو گھڑی آپ بھی ہونٹوں کو دبائے رکھنا
آج کی رات نہ پھر لوٹ کے آئے گی کبھی
اِس حسیں رات کو آنکھوں سے لگائے رکھنا
خونِ دل دے کے کنول مَیں نے کئے ہیں روشن
اِن چراغوں کو حفاظت سے جلائے رکھنا

کہا تو خوب یہ تم نے، چلو خدا دیکھیں
تمہیں تو دیکھ لیا، اس کے بعد کیا دیکھیں

نکل پڑے ہیں یونہی زندگی کی راہوں پر
کبھی یہ ہوگا بھی طے ہم سے فاصلہ دیکھیں

تھا جن کو آنا وہ آ کر چلے گئے کب کے
یہاں پہ بیٹھ کے اب کس کا راستہ دیکھیں

ہمارا کام تو چلنا تھا بس رہے چلتے
ہیں کس مقام پہ اب یہ تو رہنما دیکھیں

زہے نصیب انہیں میری یاد آ تو گئی
وہ اب وفاؤں کا دیتے ہیں کیا صلہ دیکھیں

خدا سمجھ کے انہیں پوجتا رہا ہوں میں
وہ میرے جرم کی دیتے ہیں کیا سزا دیکھیں

بہت گھٹن ہے کنولؔ آج کل دماغوں میں
"چلو کہ شہر سے باہر کھلی فضا دیکھیں"

نفس نفس میں نہاں اضطراب ہوتا ہے
بلا کی چیز یہ دَورِ شباب ہوتا ہے
ہے دفن اس میں ہر اک زندگی کا افسانہ
ہر ایک چہرہ مکمل کتاب ہوتا ہے
کسی کی یاد میں گذرا ہوا ہر اِک لمحہ
بہت حسین، بہت لاجواب ہوتا ہے
کسی کا نام بدلنے سے کچھ نہیں ہوتا
گلِ گلاب ہمیشہ گلاب ہوتا ہے
وفا میں جان بھی جائے تو غم نہ کر اے دِل
وفا کی راہ میں مٹنا ثواب ہوتا ہے
مِرے سلامِ محبت پہ آپ چپ کیوں ہیں
ہر اک سوال کا کچھ تو جواب ہوتا ہے
جنہیں نصیب ہوئی ہے کنولؔ شبِ ہجراں
انہیں خبر ہے کہ کیا اضطراب ہوتا ہے

نہ لنگر ہے نہ کوئی بادباں ہے
سفینہ عمر کا پھر بھی رواں ہے

خزاں ہے یا بہاروں کا سماں ہے
چمن کی مختصر سی داستاں ہے

وہی کھاتا کھلاتا ہے جہاں میں
کوئی مہماں نہ کوئی میزباں ہے

نہیں موقوف برسوں پر جوانی
جواں وہ ہے کہ جس کا دل جواں ہے

بہت کم دیکھتا ہے وہ زمیں پر
خدا بندے سے اتنا بدگماں ہے

دھڑکتا ہے جہاں بھی ہاتھ رکھیں
"خدا جانے مقامِ دل کہاں ہے"

کنولؔ اب سانس بھی لیتا ہے مشکل
فضا میں اِس قدر گہرا دھواں ہے

چاند تاروں کی ڈگر ہو جیسے
دل بھی اِک روپ نگر ہو جیسے

رُوح جیسے ہو مسافر، کوئی
جسم اِک راہ گذر ہو جیسے

اپنے سینے سے لگا رکھا ہے
غم بھی اِک لختِ جگر ہو جیسے

دُور تک سارا جہاں ہے خاموش
رات کا پچھلا پہر ہو جیسے

دل بہت یار بسا اُجڑا ہے
یہ بھی دِلّی کا نگر ہو جیسے

زندگی ہم نے گذاری اَے دوست
غم کی اک رات بسر ہو جیسے

زندگی آنچ سی دیتی ہے کنولؔ
یہ بھی شعلوں کا سفر ہو جیسے

سائے میں دھرتی کے گہری نیند سو جاتے ہیں لوگ
خاک سے ہوتے ہیں پیدا، خاک ہو جاتے ہیں لوگ

کون روتا ہے پرائے درد سے اَے دوستو
اَپنے اَپنے غم کا رونا آکے رو جاتے ہیں لوگ

کیا خبر کیوں چھیڑ کر پھر داستانِ غم مری
دامنِ دل میرا اشکوں سے بھگو جاتے ہیں لوگ

جینے والوں کو لپک کر تھام لیتے ہیں سبھی
ڈوبنے والوں کو دنیا میں ڈبو جاتے ہیں لوگ

عمر بھر ملتا نہیں ہے ان کا پھر کوئی پتہ
زندگی کی بھیڑ میں ایسے بھی کھو جاتے ہیں لوگ

داغِ عصیاں، خونِ دل سے بھی نہیں مٹتے کنولؔ
کون کہتا ہے انہیں اشکوں سے دھو جاتے ہیں لوگ

○

خوابِ نورانی کی جیتی جاگتی تعبیر ہے
آدمی اللہ کی اک شوخ سی تصویر ہے

جو زمیں پر رینگتی رہتی ہے وہ تقدیر ہے
جو فلک تک لے اڑے انساں کو وہ تدبیر ہے

ہو سکے تو آپ رکھیں اس کو دل کے آس پاس
غم سُتا ہے زندگی کے واسطے اکسیر ہے

ایک شب کے ہیں مسافر سب سرائے دہر میں
کون کہتا ہے یہ میری، آپ کی جاگیر ہے

کون ٹھہرا ہے بساطِ وقت پر بولو یہاں
اَب نہ دارا ہے، سکندر ہے، نہ عالمگیر ہے

بدگماں ہو کر نہ دیکھو چاند کو تم اس طرح
یہ بھی ہلکی سی تمہارے حُسن کی تصویر ہے

تھے کبھی غنچہ بکف سب لوگ اپنے اے کنولؔ
آجکل تو ہر کسی کے ہاتھ میں شمشیر ہے

دیکھتا ہے جب کبھی مسجد کو میخانے کے ساتھ
شیخ بھی آنکھیں لڑا لیتا ہے پیمانے کے ساتھ

آپ نے ترکِ تعلق کر لیا، اچھا کِیا
عمر بھر کی ورنہ رسوائی تھی دیوانے کے ساتھ

ہم کو اُن سے عشق تھا دنیا نے لیکن دیکھئے
لاکھ افسانے گھڑے ہیں ایک افسانے کے ساتھ

آپ کو کم یا زیادہ کا اگر شک ہے حضورؐ
اپنا پیمانہ بدل لیں میرے پیمانے کے ساتھ

ہم جہاں پہنچے ہیں غم بھی ساتھ پہنچا ہے وہاں
ایک صحرا چل رہا ہے ایک دیوانے کے ساتھ

اَب بلا سے اپنے گلشن میں بہار آئے نہ آئے
ربط پیدا کر لیا ہے ہم نے ویرانے کے ساتھ

ہو لگن سچّی کنول تو ایک ہو جاتے ہیں دل
شمع جل کر راکھ ہو جاتی ہے پروانے کے ساتھ

محبّت دل میں جب انسان کے گھر کر گئی ہو گی
تبھی کعبہ بنا ہو گا، تبھی کاشی بنی ہو گی

اندھیرا ہے مرے دل کو جلا کر ساتھ لے جانا
جہاں تک آپ جائیں گے وہاں تک روشنی ہو گی

رواں ہیں جانبِ منزل یہی کہتے ہوئے خود سے
جو اب کے بار آئیگی، وہ منزل آخری ہو گی

شبِ ہجراں مریضِ غم کو یہ کہکر تسلّی دی
سحر آخر سحر ہے، آتے آتے رک گئی ہو گی

مجھے تنہائیوں سے گفتگو کرنیکی عادت ہے
جو دل تک آپکے پہنچی وہ میری خامشی، ہو گی

اندھیروں میں ہیں پوشیدہ ہزاروں راز آدم کے
اُجالا مانگنے والو۔ بہت بے پردگی، ہو گی

کنولؔ ہر زخم پر رکھنا پڑیگا وقت کا مرہم
اِسی سے درد کی شدّت میں کہتے ہیں کمی ہو گی

وفا تو آپ سے مُمکن نہ تھی جفا کرتے
کِسی طرح تو محبّت کا حق ادا کرتے

جواب ان کی نگاہوں سے صاف ظاہر تھا
لبوں پہ مُہر لگی تھی سوال کیا کرتے

اَب اَور مجھ سے تو اَگلے جنم کی بات نہ کر
کٹی ہے عمر یہی اِک خُدا خُدا کرتے

خدا کا خوف نہ ہوتا اگر زمانے کو
خدا ہی جانے کہ دنیا کے لوگ کیا کرتے

تم اپنے ہو کے بھی اپنے نہ جب ہوئے اَے دوست
تمہیں بتاؤ کہ اپنوں سے کیا گِلا کرتے

ہمارے بس میں نہ تھی زندگی یہاں ورنہ
ہم اس کے در پہ فقیروں سی کیوں صدا کرتے

لگائے بیٹھے تھے چہروں پہ سب نئے چہرے
بھلے بُرے کا کنوّل خاک فیصلہ کرتے

زندگی کیا وہ جسے غم کی حرارت نہ ملی
دِل نہیں دل وہ جسے درد کی دولت نہ ملی

یاد کرتے بھی تو کس وقت خدا کو ہم لوگ
عمر بھر ہم کو گناہوں ہی سے فرصت نہ ملی

رنج و غم ، آہ و فغاں، دردِ محبّت، آنسو
سب ملے ہم کو مگر ان کی عنایت نہ ملی

ہم نے سَو بار سُنا، غور سے پرکھا لیکن
ہم کو دُنیا کے فسانے میں حقیقت نہ ملی

جا کے ہر سمت پُکار آئے جہاں میں لیکن
ہم کو اس دور میں ڈھونڈے سے محبت نہ ملی

میں نے ہر دل میں کنول جھانک کے دیکھا لیکن
دِل کے احساس میں وہ پہلی سی شدت نہ ملی

نور ہی نور تھا۔ رات خاموش تھی۔ پھر اچانک گئی جیسے ڈر چاندنی
سہمی سہمٹی ہوئی بھاگ کر سو گئی۔ چاند کی گود میں رکھ کے سر چاندنی
ان سے مانگا کبھی جو وفا کا صلہ۔ ہونٹ انکے سِلے کے سِلے رہ گئے
رنگ چہرے کا یوں زرد سا ہو گیا۔ جیسے ہوتی ہے وقتِ سحر چاندنی
کل نہ جانے کہاں جاکے بجلی گری۔ کس کا جلتا رہا رات بھر آشیاں
لمحہ لمحہ پگھلتا رہا چاند بھی۔ غم میں جلتی رہی رات بھر چاندنی
یہ سُنا ہے کہ پونم کی ہر رات کو۔ شاہ جہاں اور ممتاز کی یاد میں
رقص کرتی ہوئی تاج کے ہر طرف۔ سنگِ مرمر پہ جاتی ہے مر چاندنی
دُور شہنائیاں بج رہی تھیں کہیں سج رہی تھیں کہیں اجنبی دُلہنیں
لے کے تاروں کی ڈولی فلک پر اُدھر۔ چل پڑی اپنے پی کے نگر چاندنی
جب بھی چلتے ہیں دو دل ستاروں تلے، لے کے اپنے دلوں میں نئے ولولے
چاند کے شامیانے سے آ کر وہاں۔ کھول دیتی ہے جنت کے در چاندنی
وقت ہوتا ہے دنیا میں ہر چیز کا۔ وقت پر چیز لگتی ہے اچھی بُری
چوٹ کھائے ہوئے آدمی کے تنِ کنول۔ پھونک دیتی ہے قلب و جگر چاندنی

شکایت کیا کریں وُہ آسماں سے
محبّت ہے جنہیں دردِ نہاں سے

جلا دیتا ہوں اپنے آپ تنکے
مِری بنتی نہیں ہے آشیاں سے

مِرے دِل کی حقیقت آپ جانیں
کہوں تو کیا کہوں اپنی زباں سے

نہ منزل ہے نہ گردِ راہِ منزل
بِچھڑ کر رہ گیا ہوں کارواں سے

یقیناً ایک دن دُنیا سُنے گی
مِری بھی داستاں تیری زباں سے

اُسی کو ہم سمجھ لیتے ہیں منزل
کوئی آواز دیتا ہے جہاں سے

کنوؔل بارِ گراں ہے زندگانی
نہیں اُٹھنے کا دوشِ ناتواں سے

اُلفت سے تہی دل کیا جانے، کیا چیز محبّت ہوتی ہے
مایوس تمنّا جانتے ہے کیا چیز عبادت ہوتی ہے
کانٹوں سے الجھنا آساں ہے۔ پھولوں سے گذرنا مشکل ہے
دامن سے لپٹ کر رو دینا۔ پھولوں کی عادت ہوتی ہے
دل توڑ کے جانے والے نے یہ کاش کبھی سوچا ہوتا
دل آخر وہ بھی دل ہی تھا، ہر دل کی قیمت ہوتی ہے
دو چار قدم پر ساحل سے غرقاب سفینہ ہو جائے
ایسا بھی کبھی ہو جاتا ہے۔ ایسی بھی قسمت ہوتی ہے
اے گردشِ دَوراں بچ کے ذرا یہ بستی ہے دیوانوں کی
یہ چاک گریباں کر دیں گے، دیوانوں میں وحشت ہوتی ہے
لازم تو نہیں توہینِ وفا۔ شکووں کو زباں پر لے آنا
خاموش بھی نغمے ہوتے ہیں خاموش بھی الفت ہوتی ہے
جب ان کا تصوّر ہوتا ہے خاموش سہانی راتوں میں
اس وقت کنول اپنے دل کی کچھ اور ہی حالت ہوتی ہے

کس کو غمِ جہاں سے مکمّل نجات ہے
غم زندگی کی راہ میں آبِ حیات ہے

رُوٹھے ہوئے ہیں پھر بھی وہی التفات ہے
دِل کہہ رہا ہے آج کوئی خاص بات ہے

یوں تو طویل سب ہیں محبت کے راستے
سب سے طویل آہ مگر غم کی رات ہے

ہوتی ہیں اس پہ گریۂ پیہم کی یورشیں
گویا یہ دل نہیں ہے کوئی سومنات ہے

یوں تو حسیں ہیں اور بھی قدرت کی نعمتیں
سب سے مگر حسیں یہ محبّت کی ذات ہے

ناکامیِ حیات پہ نادم نہیں ہوں مَیں
میری شکست فاتحِ جہاں بھر کی مات ہے

ہاتھوں سے گر کے ٹوٹ گیا جامِ مَے کنول
اس میں ضرور میرے مقدّر کا ہات ہے

شعورِ غم نہ ہو جن کو، وہ فرزانے نہیں ہوتے
جنوں سے جو الجھ جاتے ہیں دیوانے نہیں ہوتے
وُہ گلشن کیا جہاں کلیاں ترستی ہوں چٹخنے کو
جہاں وحشت پہ پہرے ہوں وہ ویرانے نہیں ہوتے
مزا جب ہے انہیں سن کر نہ دو عالم کو نیند آئے
جنہیں سُن سُن کے نیند آئے وہ افسانے نہیں ہوتے
چھلک کر دستِ ساقی سے لبوں تک جو نہ آ پہنچیں
نہیں ہوتے نہیں ہوتے، وُہ پیمانے نہیں ہوتے
نہ جن کی چلمنوں سے جھانکتی ہو زندگی ہمدم
درِ زنداں تو ہو سکتے ہیں میخانے نہیں ہوتے
تعجّب کیا اگر خود رہنما ہی راہزن نکلیں
دغا دیتے ہیں جو دل کو وہ بیگانے نہیں ہوتے
خدا جانے وہ دانستہ مجھے کیوں تکتے رہتے ہیں
کنوّل کیا اور اس محفل میں دیوانے نہیں ہوتے

اِس دنیا میں آکر ہم نے بس اتنا ہی کام کیا
جیسے تیسے کاٹ لیا دن ، رات ہوئی آرام کیا
دھن دولت کی اس دنیا میں دل سی شئے کا مول ہی کیا
جب جی چاہا توڑ دیا اور جب چاہا نیلام کیا
ہم دیوانے لوگ ہیں یارو ، پیار محبّت کیا جانیں
پیار کو ہم نے تہمت سمجھا ، لفظِ وفا بدنام کیا
دُنیا نے ہر جام خوشی کا ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا
ہم نے ہر ٹکڑے سے پیدا ایک نیا ہی جام کیا
سوچا تھا کہ پیار کے بدلے پیار ملیگا لوگوں سے
آج مگر احساس ہوا کہ یہ بھی خیالِ خام کیا
خاک ہوئے تو پھول کھلائے ۔ آنکھ لگی تو جاگ اٹھے
ایسے ہم نے دل پر غم کا ، ہر حملہ ناکام کیا
تھا معلوم کہ ہے یہ دنیا حرص و ہوس کا دام کنول
کیا جانے کیا سوچ کے پھر بھی دل کو اسیرِ دام کیا

پھولوں کی انجمن سے، دامانِ کہکشاں سے
آواز دے رہا ہوں دیکھو کہاں کہاں سے
نغمہ جہاں سُنو تم دھرتی سے آسماں سے
میرا پتہ ملے گا، تم کو وہاں وہاں سے
کہتے ہیں رہگذر پر، مدھم نشاں نشاں سے
صدیوں سے کارواں ہیں لاکھوں رواں دواں سے
سو بار لے چکی ہیں وہ امتحان اس کا
ڈرتی ہیں بجلیاں بھی اب میرے آشیاں سے
دل اور دماغ دونوں، میرے وہیں پڑے ہیں
آنے کو آگیا ہوں، میں دُور گلستاں سے
رشتہ اگر دلوں کا اب بوجھ ہے تو آؤ
دیوار ہم گرا دیں اب یہ بھی درمیاں سے
منزل کنول ملے گی اک دن ہمیں یقیناً
چلتے اگر رہے ہم کچھ دُور کارواں سے

ہم دِل کو تمنّاؤں میں اُلجھائے ہوئے ہیں
یوں گردشِ حالات کو بہلائے ہوئے ہیں
ناکامیٔ تقدیر پہ ہنس لیتے ہیں اکثر
ہم دل کو بہت دیر سے سمجھائے ہوئے ہیں
اُٹھتے ہی نہیں اور کسی سمت قدم اَب
یہ کونسی منزل ہے کہاں آئے ہوئے ہیں
اللہ رے وہ ہنستی ہوئی مست نگاہیں
اِک ساتھ کئی جام سے لہرائے ہوئے ہیں
ہو وقتِ نمو جیسے کہیں صُبح کا سُورج
یوں رُخ سے نقاب آج وہ سرکائے ہوئے ہیں
کچھ تو یہ شکنِ حُسن ہے کچھ آپ بھی برہم
"کچھ گیسوئے شب تاب بھی بل کھائے ہوئے ہیں"
معصُوم سے چہرے پہ کنول لاج کا پردا
کیا جانیئے کس بات پہ شرمائے ہوئے ہیں

پتہ منزل کا مِلتا ہے کسی کی خاکِ پا ہو کر
حیاتِ جاوداں ملتی ہے دنیا میں فنا ہو کر
محبّت کا حسیں نغمہ چلے تھے لے کے ہم لیکن
جہاں میں کھو گئے ہیں اب صدائے بے نوا ہو کر
نہ جانے لگ گئی کس کی نظر اپنے مقدّر کو
خوشی بھی جب کبھی آئی تو آئی بددعا ہو کر
محبّت اُن سے کرنے کا صلہ پایا تو یہ پایا
وہ اب جو ہم سے ملتے ہیں تو ملتے ہیں خدا ہو کر
خفا ہیں آپ بھی ہم سے زمانہ بھی الگ برہم
بہت دشوار ہے دنیا میں جینا آپ کا ہو کر
مری فکرِ سخن کو اِک نئی پرواز مل جائے
کہیں سے آپ آجائیں اگر نغمہ سرا ہو کر
خیالوں کے جزیروں میں کنول سے مُسکراتے ہیں
مری دُنیا میں آیا ہے کوئی جب سے خُدا ہو کر

کسی کے ہونٹ جب ڈوبے شرابِ ارغوانی میں
ہُوا محسوس جیسے آگ لپکی سرد پانی میں

بہت دلچسپ ہے لیکن ابھی تک نامکمل ہے
ہمارا نام بھی لکھ دو محبّت کی کہانی میں

کرم کا شُکریہ لیکن ہمیں اتنا بتا دو، کیا
خلُوصِ دل بھی شامل ہے تمہاری مہربانی میں

نہ دیکھو خامشی میری غلط انداز نظروں سے
ہزاروں درد گویا ہیں مری اک بے زبانی میں

کبھی دل چیر کر نکلا، کبھی ٹپکا نگاہوں سے
"ہو میں کس بلا کا جوش تھا عہدِ جوانی میں"

نہیں کچھ بولتیں لیکن انہیں بے کار مت سمجھو
نگاہیں کام آتی ہیں دلوں کی ترجمانی میں

کسی کا دل جلے جس سے کسی کی آنکھ بھر آئے
لگا دو آگ، بہتر ہے کنول اس شادمانی میں

اَشک رُک رُک کے مری آنکھ سے جب ڈھلتے ہیں
لوگ کہتے ہیں، محبت کے دیئے جلتے ہیں
ہم کو ساحل سے غرض اور نہ موجوں سے گِلہ
اپنی ہر سانس میں طوفانِ بلا پلتے ہیں
غم کے پہلو میں جنوں اور نکھر جاتا ہے
ظلمتِ شب میں نئے شام و سحر پلتے ہیں
یہ بھی کیا خوب تماشا ہے بھری محفل میں
میرے آنے پہ وہ کہتے ہیں کہ ہم چلتے ہیں
وقتِ رخصت یہ بھلا آنکھ میں آنسو کیسے
ایسے لمحات بھی ٹالے سے کبھی ٹلتے ہیں
ہم پہ تہمت ہے کنولؔ۔ پیار ہے اپنا شیوہ
شوق سے لوگ جلیں ہم سے اگر جلتے ہیں

○

گُلبدن، جانِ غزل، غنچہ دہن سمجھے تھے ہم
کیا کہیں، کیا کیا تجھے اے سیم تن سمجھے تھے ہم
تھا تمہاری ہر ادا سے پیار ہم کو اس قدر
بے رخی کو بھی تمہارا بانکپن سمجھے تھے ہم
ماسوائے گمرہی کچھ بھی نہیں آتا نہیں
کام کے ہوں گے یہ شیخ و برہمن سمجھے تھے ہم
غم کا سایہ تھا جسے کہتی رہی دنیا خوشی
وُہ خوشی نکلی جسے غم کا کفن سمجھے تھے ہم
رہ گیا ہے آج کی تہذیب کا بن کر مذاق
وہ ادب جس کو علاجِ علم و فن سمجھے تھے ہم
ہو گئے اِک بار پھر ہم خود فریبی کا شکار
راہبر نکلا وہ جس کو راہزن سمجھے تھے ہم
کیا خبر تھی اس میں اِتنے درد پنہاں ہیں کنولؔ
زندگی کو محفلِ شعر و سخن سمجھے تھے ہم

بادِ صبا بتا تو ہی، وہ بھی ہیں بیقرار کیا
میری طرح ہی اِن دنوں وہ بھی ہیں اشکبار کیا
مجھکو تو کچھ پتہ نہیں تو ہی بتا اَے نامہ بر!
میرا کہا سُنا انہیں گذرا ہے ناگوار کیا
ہے یہ حیاتِ مختصر ہنس کے نہ کیوں گذار دیں
لمحے خوشی کے دوستو آتے ہیں بار بار کیا
آنسو سمجھ کے خاک میں مجھکو نہ یوں ملایئے
پانی کی ایک بوند کا ہوتا نہیں وِقار کیا
ٹکتا نہیں ہے ایک پل آیا اِدھر گیا اُدھر
دِل پہ یقیں نہ کیجئے دل کا ہے اِعتبار کیا
اَوروں کی ایک بھول پر، کرتا ہے شور آدمی
اپنی غلط پہ بھی کبھی ہوتا ہے شرمسار کیا
صحنِ چمن میں ناز سے کرتی ہے رقص اے کنول
اُن کی نظر کو چوم کر آئی ہے یہ بہار کیا

چھٹکے ہیں تیرگی میں ستارے کبھی کبھی
کام آ گئے ہیں غم کے شرارے کبھی کبھی

طوفان بن گئے ہیں کبھی میرے واسطے
موجوں میں مل گئے ہیں کنارے کبھی کبھی

اپنوں کی بے رخی سے تغیّر کے خوف سے
بیگانے بن گئے ہیں ہمارے کبھی کبھی

اَے دوست! تم سے ترکِ تعلق کے باوجود
خوابوں میں کھو گئے ہیں تمہارے کبھی کبھی

بے خوف ہم قضا کی حدوں سے گذر گئے
کرتی رہی حیات اِشارے کبھی کبھی

روتے رہے ہیں یاس کے مارے تمام رات
دن اس طرح بھی ہم نے گذارے کبھی کبھی

تنہا روی کی خیر، محبت میں اَے کنول
ٹھکرا دیئے ہیں ہم نے سہارے کبھی کبھی

کچھ اندھیرے ہیں کچھ اُجالے ہیں
عِشق کے راستے نِرالے ہیں
محفلِ دل میں آج رونق ہے
درد ہے، بے بسی ہے، نالے ہیں
اپنی تقدیریں کہیں گی افسانے
کیا ہوا جو لبوں پہ تالے ہیں
دل ہمارا نہ توڑ اَے دُنیا
ہم بھی ناز و ادا کے پالے ہیں
آپ نے غم دیئے جو ہنس ہنس کر
ہم نے وہ قہقہوں میں ڈھالے ہیں
ہم سے اتنے نہ دُور ہو بیٹھو
ہم بھی دنیا کے رہنے والے ہیں
شِعر کیا ڈوب کر کنولؔ ہم نے
بحرِ غم سے گہر نکالے ہیں

وفا جس کی ہستی میں شامل نہیں ہے
وہ دل ہی محبت کے قابل نہیں ہے

جو منزل پہ لے جائے طوفاں کہاں کا
جو کشتی ڈبو دے وہ ساحل نہیں ہے

ارادوں پہ قائم ہے ہستی ہماری
اگر جینا چاہو تو مشکل نہیں ہے

چراغوں کے بدلے یہاں دل جلاؤ
یہ دنیا ستاروں کی محفل نہیں ہے

جدھر سے وہ گذرے یہی شور اٹھا
میرا دل نہیں ہے مرا دل نہیں ہے

زمانے کی گردش میں الجھا ہوا ہوں
مرا دل مگر تجھ سے غافل نہیں ہے

کنول جس کو سمجھا ہے تو اپنی منزل
وہ منزل کا دھوکا ہے منزل نہیں ہے

اَب کہاں کے کرم رہ گئے
بَس سِتم ہی سِتم رہ گئے
مِل کے سب نے خوشی بانٹ لی
اپنے حصّے میں غم رہ گئے
جن کو جانا تھا وہ چل دیئے
راہ تکنے کو ہم رہ گئے
منزلِ عشق نکلی کڑی
ڈگمگا کر قدم رہ گئے
جان دے کر نہ بھی کچھ بنا
دل میں سَو سَو بھرم رہ گئے
بے وفا ہے کنوؔل ہر کوئی
با وفا اَب تو کم رہ گئے

وقت جب کروٹیں بدلتا ہے
کاروانِ حیات چلتا ہے

عشق سہہ کر بھی غم نہیں مرتا
حُسن بزدل ہے حُسن ڈھلتا ہے

جب لپکتا ہے موت کا شعلہ
زندگی کا چراغ جلتا ہے

غم وہ پارس ہے جس کے چھونے سے
درد آرام میں بدلتا ہے

اِس نئے دَور کا خُدا حافظ
آدمی آدمی سے جلتا ہے

اس جہاں میں وفا ہے اب جیسے
کوئی مدّھم چراغ جلتا ہے

شِعر کہنا کنولؔ نہیں آساں
دِل جگر چیر کر نکلتا ہے

یہ انقلاب ہُوا کس طرح خدا جانے
جنوں کی بات سمجھنے لگے ہیں فرزانے
غمِ جہاں سے گھڑی دو گھڑی سکوں پانے
تِری تلاش میں نکلے ہیں تیرے دیوانے
یہ کس کی چشمِ فسوں ساز کا کرشمہ ہے
کہ دیکھنے سے فقط بھر گئے ہیں پیمانے
ہر ایک رِند بلا نوش کو خبر کر دو
کہ پی کے شیخ چلے آ رہے ہیں سمجھانے
یہ کس کی تشنہ لبی چھا گئی فضاؤں پر
اُداس اُداس ہیں ساغر، اُداس میخانے
کرا دیا ہے ہمیں روشناس اپنوں سے
بڑے ہی کام کے نکلے جہاں میں بیگانے
اِسی کا نام جوانی نہ ہو کنولؔ، دیکھو
لگا ہے آج کوئی آئینوں سے شرمانے

ہوش میں آتا ہے انساں ٹھوکریں کھانے کے بعد
دن نکلتا ہے اندھیری رات ڈھل جانے کے بعد
ہر کوئی دنیا میں اپنے کو سمجھتا ہے خدا
ایک دیوانہ پڑا ہے ایک دیوانے کے بعد
آپ آنکھوں سے پلائیں اور پھر دیکھیں ذرا
ایک پیمانہ بھرے گا ایک پیمانے کے بعد
کون کہتا ہے نہیں ہے عشق میرا کامیاب
ذکر کرتے ہیں وہ میرا اپنے افسانے کے بعد
ایک پردہ بھی رہے گا۔ دل لگی کی دل لگی
ایک مسجد بھی بناؤ ایک میخانے کے بعد
لے تُکی کرتا ہے باتیں جب تلک پیتا نہیں
ہوش میں آتا ہے واعظ جام چھلکانے کے بعد
کیا کرے کوئی بھروسہ رہنماؤں پر کنولؔ
خود بھٹک جاتے اکثر ہم کو سمجھانے کے بعد

ذرا چھو گئی تھی کسی گلبدن سے
ہوا رقص کرتی گئی ہے چمن سے

چمن سے مرا ربط ہے دو گھڑی کا
یہ کہہ کر کلی ہنس پڑی بانکپن سے

وفاؤں کا دامن کہیں جل رہا ہے
کہ بُو آرہی ہے ہر اک پیرہن سے

نہیں دیں زمانے نے ان کو پناہیں
جو اٹھ کر گئے ہیں تری انجمن سے

اندھیروں کو اکثر اُجالا ملا ہے
محبّت کی ہلکی سی میٹھی کرن سے

وطن میں ہیں، محسوس ہوتا ہے لیکن
بہت دُور ہیں ہم ابھی تک وطن سے

کنولؔ ڈھونڈ لیں سب نئے آسماں راہیں
"ہمیں ہیں جو اُلجھے ہیں دار و رسن سے"

محبّت کیا جو بڑھ کر جان کا آزار ہو جائے
مسیحا کیا جسے مل کر کوئی بیمار ہو جائے

بھروسہ اُس کی رحمت پہ اگر اک بار ہو جائے
سفینہ موجِ طوفاں سے یقیناً پار ہو جائے

بھلے ہی زندگی اس کیلئے دشوار ہو جائے
بشر کو چاہیئے کہ صاحبِ کردار ہو جائے

ابھی کچھ دیر میں فصلِ بہاراں گُل کھلائیگی
ذرا کہہ دو یہ دیوانے سے وہ ہُشیار ہو جائے

اگر تم مسکرا دو، دو گھڑی اس ظلمتِ شب میں
ستاروں سے منقّش ہر در و دیوار ہو جائے

خدا نے سوچ کر ہی غم دیئے ہیں ساتھ خوشیوں کے
"اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے"

جسے رُکنے کی خواہش ہو کنولؔ اس دہرِ فانی میں
اُسے کہہ دو کہ چلنے کے لیئے تیّار ہو جائے

ثابت ہُوا یہ دل ہی مِرا دام آخری
ہونٹوں پہ تھا کسی کے یہ پیغام آخری
ہم نے لگا دیئے ہیں وفاؤں کو چار چاند
دنیا میں کر چلے ہیں یہی کام آخری
دیوانہ کہہ کے ہم کو بلاتا ہے ہر کوئی
پایا ہے چاہتوں کا یہ انعام آخری
گزرے ہیں اسطرح بھی محبّت کی راہ سے
لگتا رہا ہے ہم کو ہر اک گام آخری
رتبہ دیا ہمیں نے عبادت کا پیار کو
آیا ہمارے سر ہی یہ الزام آخری
جس کا تھا زندگی کو سحر ہی سے اِنتظار
لگتا ہے آ رہی ہے وہی شام آخری
یہ سوچ کر لبوں سے لگائے ہوئے ہوں مَیں
شاید کنول ہو جام یہی جام آخری

دِل ہے حضورِ دِل، یہ کوئی آئینہ نہیں
سنگِ فریب کھا کے بھی یہ ٹوٹتا نہیں

صحرا میں، جنگلوں میں، خدا ڈھونڈتے ہیں لوگ
اپنے ہی دل میں کوئی مگر جھانکتا نہیں

اِس درجہ ہو گیا ہے لہو آجکل سفید
رِشتہ کسی سے کیا ہے کوئی جانتا نہیں

اُلٹا تمہیں پہ لوگ اٹھائیں گے اُنگلیاں
کہنے سے صاف بات کوئی فائدہ نہیں

خوشیوں کی مے، غموں کا نشہ، موت کا سرور
اِس زندگی سے بڑھ کے کوئی میکدہ نہیں

پُر پیچ راستوں سے وہ ہوتا ہے آشنا
"رہزن سے بڑھ کے اور کوئی رہنما نہیں"

کیا جانے انجمن کو یہ کیا ہو گیا کنولؔ
ہر شخص دیکھتا ہے مگر بولتا نہیں

نام لکھتے ہیں مِرا اور مِٹا دیتے ہیں
یوں مجھے میری محبّت کا صِلہ دیتے ہیں

حوصلہ ٹوٹے ہوئے دل کا بڑھا دیتے ہیں
جب وہ آواز میں آواز مِلا دیتے ہیں

گردشِ وقت ہمیں ڈھونڈ نہ لے اس ڈر سے
ہم سرِ شام چراغوں کو بُجھا دیتے ہیں

میں جو کہتا ہوں کہ انجامِ محبت کیا ہے
وُہ مرے سامنے اک شمع جلا دیتے ہیں

آپ یوں ہم کو سرِ بزم نہ دیکھا کیجے
لوگ اِک بات کی سو بات بنا دیتے ہیں

جلوۂ حق تو ہر اک سمت ہے پھیلا لیکن
ہم اُسے جھوٹ کے دامن میں چھپا دیتے ہیں

بے وفاؤں کی کنولؔ بات الگ ہے لیکن
اَب ہمیں اہلِ وفا دیکھیے کیا دیتے ہیں

ہے نہ مندر میں خُدا اور نہ میناروں میں
وہ تو رہتا ہے اسی جسم کی دیواروں میں

دو گھڑی چین سے جینا بھی میسّر نہ ہوا
زندگی ڈوب گئی موت کی یلغاروں میں

خط لکھے آپ نے اشکوں میں بھگو کر گویا
پھُول بھیجے ہیں چھپا کر مجھے انگاروں میں

وقت کے سینے میں رہ جاتی ہیں یادیں باقی
جیسے کچھ کیلیں گڑی رہتی ہیں دیواروں میں

عظمتِ شعر و سخن آج کہاں ہے اَے دوست
اَب تو فنکار نکل آئے ہیں بازاروں میں

خُم سے شیشے کو ملی، شیشے سے پیمانوں کو
اِس طرح پھیل گئی آگ یہ مے خواروں میں

لگ گئی کس کی نظر آج بہاروں کو کنول
ہر طرف خاک سی اُڑتی ہے چمن زاروں میں

ہو کر قریب دُور رہے زندگی سے ہم
گزُرے ہیں اِس جہاں سے بڑی بیدلی سے ہم

دیتا نہیں ہے کچھ بھی دکھائی کسی طرف
تنگ آ چکے ہیں اَب تو بہت روشنی سے ہم

آئے ہیں وہ مقام بھی اُلفت کی راہ میں
اپنوں سے پیش آئے جہاں بے رخی سے ہم

تہذیبِ نو کے ہوتے گئے جس قدر قریب
اتنا ہی دُور ہوتے گئے آدمی سے ہم

حاصل نہیں جہاں میں کسی شئے کو بھی ثبات
سمجھے ہیں اِک یہ راز تری تازگی سے ہم

جب جب بھی گردشوں نے دکھایا ہے آئینہ
اپنے کو بھی لگے ہیں بہت اجنبی سے ہم

آیا اگر سلام بہاروں کا اب کبھی
صحرا کو چل پڑیں گے کنول پھر خوشی سے ہم

بے شک تمہیں یہ چاند ستارا دکھائی دے
دنیا ہمیں تو آگ کا دریا دِکھائی دے

ہے کس قدر عجیب یہ دنیا کا مَیکدہ
ہر شخص جو ملے ہے وہ پیاسا دکھائی دے

فتنے سے کم نہیں ہے نئے دَور کا بشر
باہر سے وہ بھلے ہی فرشتہ دکھائی دے

اپنا بھی عکس آج میسّر نہیں ہمیں
ہر آئینہ یہاں پہ شکستہ دکھائی دے

دِل سی عجیب چیز بھی دنیا میں ہے کوئی
آتا دکھائی دے نہ یہ جاتا دکھائی دے

کِس دَور میں بہار کا موسم ہے دوستو!
گلشن میں آج پھول بھی کانٹا دکھائی دے

جا کر کسے سنائیں کنوّل داستانِ غم
جو شخص بھی ملے ہے وہ بہرا دکھائی دے

ہم کو چھیڑا تو مچل جائیں گے ارماں کی طرح
ہم پریشان ہیں تری زلفِ پریشاں کی طرح

ہر گلی آئی نظر کوچۂ جاناں کی طرح
ہم کو دُنیا یہ لگی شہرِ نگاراں کی طرح

کم نہ ہوگی یہ خلش دل کی کسی بھی صُورت
دل میں سو غم ہیں مکیں خارِ مغیلاں کی طرح

لوگ رُک رُک کے چلے جانبِ منزل لیکن
ہم رہے گرمِ سفر گردشِ دوراں کی طرح

اَب تو ہر شخص پہ ہوتا ہے گماں قاتل کا
کوئی مِلتا ہی نہیں آدمی انساں کی طرح

ہم نے بخشے ہیں اندھیروں کو اُجالے لیکن
ہم ہی بے نور رہے گورِ غریباں کی طرح

آب میں رہ کے بھی رہتے ہیں کنول اس سے الگ
"ہم تو گلشن میں بھی رہتے ہیں بیاباں کی طرح"

کھِلتی ہے چاندنی جہاں وہ کوئی بام اَور ہے
دِل کو جہاں سکوں مِلے وُہ تو مقام اَور ہے
کہتی ہے رُوح جسم سے، شاید تجھے خبر نہیں
میرا مقام تُو نہیں، میرا مقام اَور ہے
سہمی ہوئی یہ خامشی، ہونٹوں کی تیرے کپکپی
کہتی ہے صاف نامہ بر، کچھ تو پیام اَور ہے
شِکوۂ بے رخی پہ وُہ کہنے لگے کہ دیکھئے
نظروں کی بات اَور ہے دِل کا سلام اَور ہے
پیتے رہے ہیں عمر بھر، پھر بھی وہی ہے تشنگی
جس کا نشہ ہے جاوداں وہ کوئی جام اَور ہے
وقتِ گناہ دیر تک، کہتا ہے مجھ سے دل مرا
"کارگہِ حیات میں تیرا تو کام اَور ہے"
ہر شئے پہ اس جہان کی پردہ ہے اک فریب کا
کہتے ہیں سب کنولؔ مجھے، گو مرا نام اَور ہے

منجدھار میں کشتی ہے　　بکھرے ہوئے دھارے ہیں
انجام خدا جانے　　موجوں کے سہارے ہیں

مجبور ہیں مِلنے سے　　رستے ہیں الگ اپنے
تم ناز کے پالے ہو　　ہم درد کے مارے ہیں

غم لاکھ زمانے نے　　دینے کو دیئے لیکن
جو آپ سے پائے ہیں　　وہ جان سے پیارے ہیں

بربادیٔ عالم کے　　آثار نہ ہوں شاید
ہر روح پریشاں ہے　　گردش میں ستارے ہیں

پھر کوچۂ قاتل کو　　اُٹھتے ہیں قدم دیکھو
"پھر گردشِ دوراں نے　　کچھ فتنے اُبھارے ہیں"

محدود ہیں اپنی ہی　　نظروں کی حدیں ورنہ
ان چاند ستاروں سے　　آگے بھی ستارے ہیں

غمگین کنول تو ہی　　تنہا نہیں دنیا میں
اتنی بڑی دنیا میں　　غمگین تو سارے ہیں

بارہا جذبات کی موجوں میں بہہ جاتے ہیں لوگ
چوٹ کتنی بھی کڑی ہو دل یہ سہہ جاتے ہیں لوگ

منزلوں کا عمر بھر مِلتا نہیں اُنکو نشاں
کارواں سے اِسقدر پیچھے بھی رہ جاتے ہیں لوگ

وقت سے ٹکرا کے زندہ رہ نہیں سکتا کوئی
وقت کی آنکھوں سے آنسو بن کے بہہ جاتے ہیں لوگ

اِک معمّہ ہی رہا یہ اہلِ دنیا کے لئے
چھوڑ کر دنیا کو آخر کس جگہ جاتے ہیں لوگ

ہم نہیں کرتے گلہ شکوہ کسی سے اَے کنولؔ
گھوم پھر کر بات لیکن دل کی کہہ جاتے ہیں لوگ

مسکرا، دل کو کبھی رنج آشنا ہونے نہ دے
بزمِ ہستی میں کوئی محشر بپا ہونے نہ دے
اس پہ چسپاں کر محبت کے نئے نقش و نگار
زندگی کو صرف مفلس کی قبا ہونے نہ دے
شوق کہتا ہے چلا چل جانبِ منزل مگر
دل یہ کہتا ہے جنوں کو رہنما ہونے نہ دے
دوستوں کی بے وفائی کا گلہ شکوہ نہ کر
"تیرا منصب ہے کہ توہینِ وفا ہونے نہ دے"
باغِ ہستی سے گزر جا۔ جھومتا گاتا ہُوا
سازِ ہستی کو مگر تُو بے نوا ہونے نہ دے
لوگ سر آنکھوں پہ رکھیں گے تجھے بھی، تو اگر
اُن پہ ظاہر اپنے دل کا مدعا ہونے نہ دے
تو گناہوں پر پشیماں ہو نہ ہو لیکن کنول
دل سے تو اپنے جُدا خوفِ خدا ہونے نہ دے

ذرا سا مُسکرا دو، زندگی کو جاوداں کر لیں
اَدھوری رہ گئی تھی جو مکمّل داستاں کر لیں
گھڑی بھر میں بہاروں پر نہ جانے کیا گزر جائے
چلے آؤ کہ مل کر آج سیرِ گلستاں کر لیں
خرد نے آج تک رکھا ہے ہم کو دُور منزل سے
جنوں ہی کو چلو اس بار میرِ کارواں کر لیں
چلو ہم بے وفا نکلے۔ چلو تم باوفا ٹھہرے
محبّت کو ذرا سی بات پر کیوں بدگماں کر لیں
ابھی سے کس لئے بیتاب ہے تو گردشِ دَوراں
ابھی رُک جا کہ ہم تعمیر اپنا آشیاں کر لیں
زمانہ ہم سے برہم ہے زمانہ آپ کا ٹھہرا
خفا جب آپ ہوں ہم سے تو کس کو مہرباں کر لیں
ہمیں اُن سے گلے شکوے ہزاروں ہیں کنوّل لیکن
"محبّت کا تقاضا ہے کہ بند اپنی زباں کر لیں"

روتے ہیں اِس لئے کہ سہارا کوئی نہیں
اِتنے بڑے جہاں میں ہمارا کوئی نہیں
ہونے کو یوں تو اور بھی ہونگے جہان میں
ہم سا مگر نصیب کا مارا کوئی نہیں
اپنی خوشی سے کوئی بھی جیتا نہیں یہاں
پر کیا کریں کہ موت کا چارا کوئی نہیں
ایسی چلی ہوائیں کہ سب بجھ گئے چراغ
اب آسماں پہ آس کا تارا کوئی نہیں
گرداب پر نظر ہے ہر اک موج کی ابھی
ساحل کو جو رواں ہو وہ دھارا کوئی نہیں
ہوگی کبھی زمیں یہ فرشتوں کی دِل پسند
اب دیدنی یہاں پہ نظارہ کوئی نہیں
ہونے کو پاس تاؤ تھی لہریں بھی تھیں کنول
ڈوبے ہیں اِس لئے کہ کنارہ کوئی نہیں

پہنچ کر میکدے کے در پہ یوں آئی ہنسی مجھکو
کہ لے آئی کہاں آخر یہ میری تشنگی مجھکو

بہت سوچا ہے لیکن یہ نہیں سمجھا کہ آخر کیوں
اندھیروں میں لئے پھرتی ہے اکثر روشنی مجھکو

رہِ اُلفت میں سمجھاتے رہے اِک دوسرے کو ہم
کبھی دیوانگی کو میں، کبھی دیوانگی مجھکو

تجھے اَے گردشِ دَوراں لگا لیتا گلے لیکن
سنبھلنے ہی نہیں دیتی ہے میری بے خودی مجھکو

میں ہر اک راہرَو سے پوچھتا ہوں راہ منزل کی
مجھے ڈر ہے کہ لے ڈوبے گی میری سادگی مجھکو

ابھی تو زخم کھائے ہیں ابھی تو دل ہی ٹوٹا ہے
خدا جانے ابھی کیا کیا دکھائے دل لگی مجھکو

ہوئی مدّت سکونِ دل کنولؔ جاتا رہا اپنا
بہت مہنگی پڑی ہے زندگی سے دوستی مجھکو

فصلِ بہار راس نہ دَورِ خزاں مجھے
اِس درجہ کرگیا ہے کوئی بدگماں مجھے

پچھلے جنم کی اس کی مری دوستی نہ ہو
رہ رہ کے دیکھتا ہے غمِ دوجہاں مجھے

برسوں زمیں کے پیار سے میں بھی جُڑا رہا
برسوں پکارتا ہی رہا آسماں مجھے

مَت پوچھ کس طرح سے ہوئی زندگی تمام
دینا قدم قدم پہ پڑا اِمتحاں مجھے

چرچا تھا جس کا عام ستاروں میں رات بھر
اپنی ہی لگ رہی تھی فقط داستاں مجھے

رُکتی تو ڈوب جاتی یقیناً کہیں، مگر
"ساحل پہ لائی کشتیِٔ عمرِ رواں مجھے"

اَب ساتھ ہو لیا ہوں یہی سوچ کر کنول
لے جائے گا کہیں نہ کہیں کارواں مجھے

چھوڑ کر جنّت جدھر بھی حضرتِ آدم گئے
ساتھ ساتھ ان کے ہزاروں کاروانِ غم گئے

رفتہ رفتہ جب مِری آنکھوں پہ آنسو جم گئے
یوں لگا جیسے مسافر منزلوں پر تھم گئے

بے ثباتی پر تو ُچن کے رات بھر گریاں رہی
پھول کب کے وہ چمن سے دیکھ اَے شبنم گئے

مَیکدہ ویران، ساغر سرنگوں، ساقی اُداس
زندگی سے اَب سرُور و کیف کے عالم گئے

اَگلے وقتوں کی کہاں اَب رہ گئیں باتیں حضور
حُسن کی سادہ مزاجی، عشق کے دَم خَم گئے

انجمن کی انجمن تصویر بن کر رہ گئی
"اِس ادا سے آج اُن کی انجمن میں ہم گئے"

رہ گئی اَب چلچلاتی دھوپ نفرت کی کنول
چاندنی راتیں گئیں وُہ پیار کے مَوسم گئے

دِل کے داغوں سے روشنی کی ہے
ہم نے تکمیلِ زندگی کی ہے

باوفاؤ ہمیں مبارک دو
بے وفاؤں سے دوستی کی ہے

پیار سے مُسکرا کے کیوں دیکھا
آپ نے ہم سے دشمنی کی ہے

آئینہ دیکھ کر نہ شرمائیں
یہ بھی تصویر آپ ہی کی ہے

آپ اور سنگدِل ارے توبہ
ہم نے تو بات سرسری کی ہے

آپ اور یُوں مرے تصوّر میں
آپ نے بندہ پروری کی ہے

ہم مٹے ہیں یہ برہمی کیسی
اپنے دل کی کنول خوشی کی ہے

بشر کو جس سے میسّر کبھی خوشی نہ ہُوئی
وُہ اِک مذاق ہوا، کوئی زندگی نہ ہُوئی
نظر کسی کی اُجالوں سے بھر گئی دامن
چراغ ہم نے جلائے تو روشنی نہ ہوئی
خُدا کی آڑ میں کچھ لوگ پُوجتے ہیں صنم
اسے فریب کہو، یہ تو بندگی نہ ہُوئی
تمہاری یاد کے مرہم سے بھی سکوں نہ مِلا
کِسی طرح بھی مرے درد میں کمی نہ ہوئی
وُہ جس پہ ہم بھی اُمیدوں کے گُل کِھلا سکتے
وہ شاخ صحنِ چمن میں کبھی ہری نہ ہُوئی
اگر ہے عشق حقیقی تو جاں نِثار کرو
صلیب و دار سے ڈرنا تو عاشقی نہ ہوئی
ہزار شکوے گلے لب پہ رقص کرتے رہے
وہ جب ملے تو کنولؔ ہم سے بات بھی نہ ہوئی

یونہی جلائے چلو دوستو بھرم کے چراغ
کہ رہ نہ جائیں کہیں بجھ کے یہ الم کے چراغ

ہر ایک سمت اندھیرا ہے ہُو کا عالم ہے
جلاؤ خوب جلاؤ ندیم جم کے چراغ

جہاں میں ڈھونڈھتے پھرتے ہو، اے خوشی کی کرن
کہا تھا کس نے جلاؤ حضور غم کے چراغ

وفا کا ایک بھی جھونکا نہ سہہ سکے ظالم
تری ہی طرح یہ نکلے تری قسم کے چراغ

بجھا دیئے ہیں وہیں گردشِ زمانہ نے
جلائے جس نے جہاں بھی کہیں ستم کے چراغ

انہیں سے ملتی رہی منزلوں کی لو مجھکو
بہت ہی کام کے نکلے رہِ عدم کے چراغ

کنولؔ انہیں سے ملے روشنی کہیں شاید
جلا رہا ہوں یہی سوچ کر قلم کے چراغ

مجھے اُس سے کوئی گلہ نہیں کوئی رنج ہے نہ ملال ہے
مرے ساتھ ہے مری زندگی یہی سوچتا ہوں کمال ہے
نہ بُرا کسی کو کہو یہاں نہ بھلا کسی کو گنو میاں
کوئی شے بھلی یا بُری نہیں یہ تو اپنا اپنا خیال ہے
وہ بھی دیکھتے ہیں اِدھر اُدھر میں بھی سوچتا ہوں کہ کیا کہوں
نہ پیام ہے نہ سلام ہے۔ نہ جواب ہے نہ سوال ہے
نہ وفا ملے گی تمہیں کہیں یہ جنوں کا دور ہے دوستو
یہاں دشمنی تو الگ رہی یہاں دوستی بھی وبال ہے
وہی راہبر، وہی قافلے، وہی منزلیں وہی مرحلے
وہی رہزنوں کے ہجوم ہیں وہی گردشیں وہی چال ہے
ترے رنگ روپ کے شہر میں۔ مجھے ایک پل نہ سکوں ملا
تجھے کیا کہوں بتِ دل شکن ترے سامنے مرا حال ہے
یوں تو ہر قدم پہ ہے روشنی، نہیں روشنی کی کرن کہیں
ہے وہ تیرگی کہ کنول یہاں کوئی راہ ملنا محال ہے

نامہ نہ کوئی ان کا نہ زبانی پیام تھا
جانے یہ کس خطا کا عین انتقام تھا

خوشیوں کے دور میں بھی رہے ہم تو سوگوار
بھر کر بھی جو تہی تھا ہمارا ہی جام تھا

پھولوں سے دوستی تھی نہ کانٹوں سے دشمنی
"آسودۂ بہار ہمارا ہی نام تھا"

جب تک رہے وہ ساتھ گمانِ سحر رہا،
پھر اس کے بعد ہم تھے وہی وقتِ شام تھا

بیدار جب ہوئے تو تماشا ہُوا تمام
دنیا میں مختصر سا ہمارا قیام تھا

پہنچا نہ آپ تک یہ الگ بات ہے حضور
میری تباہیوں کا فسانہ تو عام تھا

ممکن نہ تھی فرار کی صورت کوئی کنولؔ
دنیا میں ہر قدم پہ محبّت کا دام تھا

بے لوٹ پڑے پیڑ کے پتّوں کی طرح ہیں
ہم گاؤں کو جاتی ہوئی سڑکوں کی طرح ہیں
فرصت ہو اگر آپ کو مِل جاؤ ہمیں بھی
ہم لوگ تو گذرے ہوئے وقتوں کی طرح ہیں
رونے پہ اگر آئیں تو رُکتے نہیں ہرگز
یہ اشک تو پگھلی ہوئی برفوں کی طرح ہیں
گھائِل ہیں مگر دیکھیئے کرتے نہیں اُف بھی
کچھ لوگ تو ہنستے ہوئے زخموں کی طرح ہیں
چُپ چاپ زمانے سے چلے جائینگے اِک دن
ہم آپ کے اُٹھتے ہوئے قدموں کی طرح ہیں
دُنیائے محبّت میں سُلگتے ہوئے ارماں
بستر پہ پڑے رات کے گجروں کی طرح ہیں
غزلیں تو بہت شوق سے لکھتے ہیں کنول ہم
دیکھو تو فقط پیار کی نظموں کی طرح ہیں

○

اِنسان نہیں وُہ جو گنہگار نہیں ہیں
وہ کون سا گُلشن ہے جہاں خار نہیں ہیں
دُنیا میں میسّر ہے ابھی جنسِ محبّت
صد حیف کہ پہلے سے خریدار نہیں ہیں
ٹوٹے ہیں نہ ہم ٹوٹیں گے اِس بارِ الم سے
نازک ہیں مگر ریت کی دیوار نہیں ہیں
دِل شوق دیں آپ مگر سوچ سمجھ کر
دُنیا میں سبھی لوگ وفادار نہیں ہیں
ہے جن کی نِگاہوں میں ہوس لفظِ محبّت
وُہ لوگ حقیقت کے پرستار نہیں ہیں
جب عزمِ سفر کر ہی لیا آؤ چلیں ہم
طُوفان کے تھمنے کے تو آثار نہیں ہیں
چڑھتا ہے کنول کون صلیبوں پہ خوشی سے
سب لوگ مسیحا کے تو اوتار نہیں ہیں

چین سے رہنا ہے دُنیا میں تو کچھ سوچا نہ کر
اپنی قسمت سے کبھی کوئی گِلہ شِکوہ نہ کر
ایک دِن گر جائے گا تو کھا کے ٹھوکر دیکھنا
زندگی کے راستوں پہ اِس قدر بھاگا نہ کر
دھوپ خوشیوں کی نکل جائیگی ہو کر پاس سے
تان کر غفلت کی چادر اِسقدر سویا نہ کر
وقت کے جھونکے نہ کر دیں ایک دن ٹھنڈا تجھے
تو پرائی آگ سے اپنا بدن تاپا نہ کر
وقت کا ریلا اُٹھا کے پھینک دیگا پھر کہیں
زندگی کی بِھیڑ میں مُڑ مُڑ کے تو دیکھا نہ کر
کیا خبر خود اپنے ہی سائے سے تو ڈرنے لگے
چاندنی راتوں میں تنہا اسطرح گھوما نہ کر
دیکھنا گُمراہ ہو کر ہی نہ رہ جائے کنوَل
ہر کسی سے منزلوں کا راستہ پوچھا نہ کر

ہر گوشۂ چمن میں نوائے ہزار ہے
شاید کہ آج آمدِ فصلِ بہار ہے

دائم یہاں خوشی ہے نہ غم پائیدار ہے
پھر کس لئے جہاں میں بشر سوگوار ہے

ویسے تو زندگی سے تعلق نہیں رہا
"زندہ ہوں اِس لئے کہ تِرا انتظار ہے"

ہیں اُن کے پاس سارے زمانے کی نعمتیں
لے دے کے میرے پاس دلِ داغدار ہے

مَیں جانتا ہوں اَب وہ نہ آئینگے لَوٹ کر
وعدے پہ اُن کے پھر بھی مجھے اِعتبار ہے

لگتا ہے اَب قریب ہی منزل ہے دوستو
چھایا ہوا فضا میں جو گردو غبار ہے

دعویٰ تو کر رہے ہیں سبھی ہوش کا کنول
دیکھو تو ہوش میں بھی کوئی ہوشیار ہے

زندگی گیسوئے ہستی کا سنور جانا ہے
موت پھر ان کا ہواؤں میں بکھر جانا ہے
وقتِ رخصت ہے تبسم کو بکھر جانے دو
کیا یہ لازم ہے کہ با دیدۂ تر جانا ہے
عشق میں ایسے مقامات بھی آتے ہیں کبھی
بارہا سوچنا پڑتا ہے کدھر جانا ہے
ہم تو اب آپکے سائے کیطرح ہیں اے دوست
آپ جائیں کے جدھر ہم کو اُدھر جانا ہے
اِک ارادہ تو کرو۔ راہ بھی مل جائے گی
ہم کو اب چاند ستاروں سے گزر جانا ہے
میں جدائی کا یہ صدمہ بھی اُٹھا ہی لوں گا
آپ چپکے سے چلے جائیں اگر جانا ہے
دہرِ فانی میں یہی سوچ کے بیٹھا ہوں کنولؔ
رہ کے کچھ روز یہاں لوٹ کے گھر جانا ہے

زندگی سے میکدہ نزدیک ہے
آپ کہتے ہیں تو بالکل ٹھیک ہے

کِس لئے کرتے خوشی کی آرزو
آرزو بھی اِک طرح کی بھیک ہے

کوئی سمجھا ہی نہیں یہ کِس قدر
زندگی کا فلسفہ باریک ہے

زندگی سے کیا شکایت کیجئے
جسطرح بھی کٹ رہی ہے ٹھیک ہے

دَورِ حاضر کا پریشاں آدمی
اِک پریشاں حال سی تحریک ہے

کہہ رہی ہے یہ ہواؤں کی مہک
موسم گل اَب بہت نزدیک ہے

کارواں کا اَب خدا حافظ کنولؔ
راستے ویران شب تاریک ہے

لوگ جن کو آج تک بارِ گراں سمجھا کئے
ہم اُنہیں لمحوں کو عمرِ جاوداں سمجھا کئے
موت کو ہم زندگی کی ترجماں سمجھا کئے
قطرۂ دریا کو بحرِ بیکراں سمجھا کئے
حسرتِ سیرِ گلستاں خواب بن کر رہ گئی
وہ قفس نکلا جسے ہم آشیاں سمجھا کئے
گو حقیقت ہی حقیقت تھی سراپا، ہم مگر
زندگی کو داستاں ہی داستاں سمجھا کئے
ہاں وہی اک شخص نکلا بے مروّت، بیوفا
ہم جسے جانِ تمنّا جانِ جاں سمجھا کئے
ہو گئے اِک بار پھر ہم خود فریبی کا شکار
وہ زمیں نکلی جسے ہم آسماں سمجھا کئے
ہائے نکلیں وہ منظّم رہزنوں کی ٹولیاں
آج تک جن کو کنول ہم کارواں سمجھا کئے

اَب سارے دیپ بجھا بابا — اِک ہی کی جوت جلا بابا
تو آیا ہے تو دُنیا میں — کچھ کر کے واپس جا بابا
کیا لے گا سونے چاندی سے — جا دھونی کہیں رما بابا
اِس روپ رنگ کی نگری سے — تو دُور کہیں اَب جا بابا
اِن رنگ برنگے چہروں میں — اَب دل کو مت اُلجھا بابا
یہ چلتے پھرتے سائے ہیں — مت ان کے پیچھے جا بابا
یہ دُنیا غم کی ماری ہے — تو گیت نہ غم کے گا بابا
اِس دل کو جس سے چین ملے — کچھ ایسی تان اُڑا بابا
سوغات ہیں صدمے جیون کی — تو ان کو گلے لگا بابا
اَپنے ہی سُکھ کی بات نہ کر — تو سب کی خیر منا بابا
اَب چھوڑ جگت کے دھندوں کو — تو اُس کا دھیان لگا بابا
اُٹھ رام نام کی بُوٹی سے — پھر سوئے بھاگ جگا بابا
جو بات مری منظور نہیں — تو آگے پیر بڑھا بابا
تُو بات کنول کی کیا جانے — اَب جان نہ میری کھا بابا

سادھو سنتوں کا بستر ہے
دُور دُور تک پھیلی گھاس
مخمل جیسی نرم لگے گی
چھُو کر دیکھو پیاری گھاس

ہری، سُنہری، کچّی پیلی
کالی اور مٹ میلی گھاس
جیسی مٹّی ہو گی پیارے
ویسی ہی تو ہوگی گھاس

اسے شوق سے کھاتے ہیں سب
ڈنگر ڈھور زمانے کے
دیتی ہے یہ کُل دنیا کو
دودھ دہی اور لسّی گھاس

بعد از مرگ اسی کے نیچے
سو جاتے ہیں سارے لوگ
بڑے کام کی چیز ہے یارو
گھاس نہیں ہے خالی گھاس

کہتے ہیں یہ لوگ سیانے
چاند گرہن کے لمحوں میں
رہتی ہے محفوظ ہر اک شے
رکھ دینے سے تھوڑی گھاس

بِنا گھاس نہ ہوتا پورا
دھرم کرم کا کوئی کام
بڑی پوِتّر ہوتی ہے یہ
گنگا جل میں بھیگی گھاس

اِس پر بیٹھ کے پیار بھرے دِل
جب کچھ باتیں کرتے ہیں
اُٹھ اُٹھ کر ان کو تکتی ہے
پاس میں ان کے لیٹی گھاس

بھری دوپہری میں جلتے ہیں　　جب سڑکوں پر سب کے پاؤں
دِل کو ٹھنڈک پہنچاتی ہے　　بھیگی بھیگی ٹھنڈی گھاس

ساون میں اِک روز کبھی تم　　نکلو باہر بستی سے
کھیت کھیت ہریالی ہوگی　　پگڈنڈی پگڈنڈی گھاس

شاخوں سے جب پھول زمیں پر　　گر جاتے ہیں چپکے سے
اُن پھولوں کا تاج پہن کر　　دلہن سی لگتی ہے گھاس

ناممکن ہے جہاں پہنچنا　　پانی اور ہواؤں کا
وہاں وہاں بھی اُگ آتی ہے　　دیکھا ہے تھوڑی سی گھاس

دُور پہاڑوں پر سردی میں　　گرتی ہے جب برف کہیں
اپنا آپ چھپا کر اس میں　　لگتی ہے چاندی سی گھاس

بات کنول اِک سچی کہہ دوں　　دونوں ہی اِک جیسی ہیں
جنم جنم کی پیاسی رو حیں　　جنم جنم کی پیاسی گھاس

○

نظمیں

نئی صبح

بکھر گئی ہیں اندھیروں میں چھپی کرنیں
نئے افق پہ نیا آفتاب نکلا ہے

گجر بجا ہے نئی صبح کا پیام لئے
غمِ حیات کے سینے کا بوجھ پگھلا ہے

نئی بہار کی دلہن سنور کے بیٹھی ہے
لبوں پہ صبحِ بہاراں کا گیت رقصاں ہے

مہک رہے ہیں ہواؤں کے ریشمی آنچل
خوشی کے ساز پہ سارا چمن غزلخواں ہے

نگاہِ شوق کے صدقے کہ ہم نے پھر اکبار
رہِ وفا میں ہزاروں دیئے جلائے ہیں

سمٹ گئی ہیں زمانے کی سرحدیں ایسے
کبھی جو دور تھے ہم سے قریب آئے ہیں

دکھا دیا ہے زمانے کو ایک جاں ہو کر
مٹا دیا ہے رقیبوں کا ہر بھرم ہم نے

بنا لیا ہے بلندی پہ آشیاں اپنا
ڈبو دیئے ہیں سبھی قہقہوں میں غم ہم نے

چلو اٹھو کہ ابھی منزلیں بلاتی ہیں
بڑھے چلو کہ یہی وقت کا تقاضا ہے

کنول بنائیں گے اپنے وطن کو ہم جنت
یہی ہے اپنی تمنا یہی ارادہ ہے

جنگ اور امن

جنگ اُگتی نہیں زمینوں سے
عقلِ آدم اُسے اگُاتی ہے

آسمانوں پہ بم نہیں بنتے
نسلِ آدم انہیں بناتی ہے

جنگ کی آہنی سلاخوں سے
نسلِ آدم ابھی نہیں نکلی

امن کی پتیوں پہ خوابیدہ
روحِ شبنم ابھی نہیں پگھلی

ہر طرف اک مہیب سنّاٹا
ہستیِ رنگ و بو پہ طاری ہے

اپنی دھرتی پہ آج بھی اے دوست
موت کا رقصِ خاص جاری ہے

آج نفرت کے تند خو شاہیں
ہر کسی روح پر جھپٹتے ہیں

جسمِ انسان پہ بھیڑیئے غم کے
آج ہر سمت سے لپکتے ہیں

آج سینوں میں درد پنہاں ہے — آج گیتوں کی لے بکھرتی ہے

ان گنت جنگ کے محاذوں سے — آج لاشوں کی بُو ابھرتی ہے

آج بھی سینکڑوں کروڑوں بم — منتظر ہیں کہ جنگ چھڑ جائے

امنِ عالم میں اک دھماکہ ہو — آدمی آدمی سے بھڑ جائے

جنگ کی ابتدا کہیں سے ہو — امنِ عالم کو چاٹ جائیگی

اپنی تہذیب کو جلا دے گی — روحِ آدم کو کاٹ کھائیگی

کیوں نہ ہم امن کے تھپیڑوں سے — جنگ کی آرزو مسل ڈالیں

پیار کے خوشنما کنول لیکر — موت کی زندگی بدل ڈالیں

پیغام

مِرے رفیق، مرے ہم سفر، مرے ساتھی

مَیں گر رہا ہوں مگر تو مرا خیال نہ کر

سنبھل، یہ مورچہ دشمن کو سونپ مت دینا

میں مر رہا ہوں مگر تو ذرا ملال نہ کر

نظر اٹھا کے ذرا دیکھ جانبِ سرحد

وطن کی آن پہ لپکے جھپٹ رہے ہیں عدو

کسی جوان نے پھر زد میں لے لیا اُنکو

جھپٹ جھپٹ کے دھڑا دھڑ پلٹ رہے ہیں عدو

وہ پھر چلی ہیں مشینوں سے گولیاں سَن سَن

فضا کے سینے پہ پھر آریاں سی چلتی ہیں

لپک رہے ہیں فضاؤں میں آہنی گولے

جواں دلوں میں اُمنگیں بھڑک کے ملتی ہیں

فضا کی رُوح میں چبھتی ہیں آج سنگینیں
کھنک رہی ہیں کہیں رنج و غم کی زنجیریں
عجیب سماں ہے اُدھر دیکھ ان پہاڑوں پر
اُبھر اُبھر کے مٹی جا رہی ہیں تصویریں

لبوں کی تھاپ پہ گاتے ہیں گیت دیوانے
ہر اک نگاہ ہیں جیسے دِیئے سے جلتے ہیں
مچل رہی ہے جوانی کے دوش پہ بجلی
ہر ایک سانس میں انگار سے نکلتے ہیں

مِرا خیال نہ کر، دشمنوں کا پیچھا کر
وطن کی آن ہے تو شعلہ بن بھڑکتا چل
گیا نہیں ہے وہ دشمن، یہیں کہیں ہوگا
قدم اٹھا کے ذرا شوق سے لپکتا چل

مجھے ملال نہیں آج اپنے مرنے کا
نئی حیات کی منزل پہ آچکا ہوں میں

وہ دیکھ، کتنی پڑیں، اجنبی سڑی لاشیں
وطن کے پیار کی قیمت، چکا چکا ہوں میں

مرے ندیم، مرے ہمسفر، مرے ہمدم
میں آج موت کی وادی میں سونے والا ہوں
مری نگاہ میں لرزاں ہے ایک تاریکی
میں اس جہاں سے بہت دور ہونے والا ہوں

جو اتفاق سے میری ملے شریکِ حیات
مری طرف سے اُسے اک سلام کہہ دینا
اٹھا کے گود میں میرے شریر بچے کو
مری طرف سے اُسے یہ پیام کہہ دینا

وطن کی چھاؤں میں سوتا ہے چین سے انساں
وطن کا پیار بناتا ہے ہم کو نورانی
وطن کی آن پہ مٹنا ہے زندگی پانا
وطن کی خاک سے ملتی ہے دل کو تابانی

ٹیگور

جوت اِک بنگال سے اٹھ کر جہاں پر چھا گئی
چاندنی بن کر فضا میں پھول سے بکھرا گئی

دھوم تھی جس کی جہاں میں ہر طرف اک شور تھا
ایک عالم جانتا ہے، وہ کوی ٹیگور تھا

اِک سراپا سوز تھا وہ ایک رنگیں ساز بھی
وہ مجسّم درد تھا اور پیار کی آواز بھی

اس کے گیتوں میں چھپی تھی دو جہاں کی سرخوشی
اس کے نغموں سے چھلکتی تھی شرابِ زندگی

اِک مسلسل جوش تھا وہ ایک بحرِ بیکراں
اس کی پیشانی کو جھک کر چومتا تھا آسماں

جنگِ آزادی کا اِک سچّا علمبردار بھی
مردِ کامل تھا وہ گویا پھول بھی، تلوار بھی

اس کے نغموں سے چھلکتی ہے حیاتِ جاوداں
اس کے گیتوں میں چھپی ہے عظمتِ ہندوستاں

وہ مصوّر تھا مگر خود ہند کی تصویر بھی
اِک سنہرا خواب تھا اور خواب کی تعبیر بھی

جذباتی ہم آہنگی

کیا ضرورت ہے رسن و دار کی باتیں کریں
پھر سے آؤ مل کے ہم سب پیار کی باتیں کریں

قوم اپنی، ملک اپنا، آسماں اپنا تو ہے
پھول اپنے، خار اپنے، گلستاں اپنا تو ہے
ہر پرایا مہرباں، نامہرباں اپنا تو ہے
کس لئے پھر تیر کی، تلوار کی باتیں کریں
پھر سے آؤ مل کے ہم سب پیار کی باتیں کریں

ایک ہے منزل ہماری ایک ہی آواز ہے
ایک ہے نغمہ ہمارا، ایک اپنا ساز ہے
ہم کو اپنے ملک پر اور بازوؤں پر ناز ہے
کس لئے پھر آج ہم بے کار کی باتیں کریں
پھر سے آؤ مل کے ہم سب پیار کی باتیں کریں

سرحدوں پر چھائے ہیں غیروں کے سائے آج کل
ہو رہے ہیں دیکھئے اپنے پرائے آج کل
ساری دنیا پر ہیں بادل غم کے چھائے آجکل

ایک دُنیا، ایک ہی سرکار کی باتیں کریں
پھر سے آؤ مل کے ہم سب پیار کی باتیں کریں

دل کے ٹوٹے آئینوں کو پھر سے آؤ جوڑ دیں
پھر سے آؤ مل کے ہم شیطان کا منہ موڑ دیں
اپنے بارے میں جہاں کے ہر بھرم کو توڑ دیں
ہم محبت پیار کی، اقرار کی باتیں کریں
پھر سے آؤ مل کے ہم سب پیار کی باتیں کریں

قسمت پنجاب ہو یا قسمت کشمیر ہو
بات کیرل کی ہو یا آسام کی تقدیر ہو
آندھرا، گجرات یا بنگال کی تصویر ہو
کس لئے ہم باہمی تکرار کی باتیں کریں
پھر سے آؤ مل کے ہم سب پیار کی باتیں کریں

ہم مراٹھا ہوں، کہ بنگالی کہ تامل دوستو
یو پی و پنجاب کا، گجرات کا دِل دوستو
کیوں نہ ہوں اِک دوسرے کے غم میں شامل دوستو
پیار کے نغموں کی اور جھنکار کی باتیں کریں
پھر سے آؤ مل کے ہم سب پیار کی باتیں کریں

○

تو اور دُنیا

مَیں سوچ رہا ہوں، مَیں یہی سوچ رہا ہوں
اک سمت ہے تو اور مری راگ کی دنیا
اک سمت ہے اُلفت سے تہی آگ کی دنیا
دنیا نے محبت کو سدا آگ بتایا
اور تو نے اُسے کیف اثر راگ بنایا
قاصر ہوں سمجھنے سے میں کس بات سے نپٹوں
میں آگ سے کھیلوں کہ ترے راگ سے لپٹوں

میں سوچ رہا ہوں میں یہی سوچ رہا ہوں
شبنم کی دَمک ہے تو ستاروں کی چمک ہے
تُو ساغرِ رنگیں ہے بہاروں کی مہک ہے
گلشن کے نئے پھول کا ہلکا سا تبسم
اور موج میں آئی ہوئی موجوں کا ترنم

تُو نُور سے دھویا ہوا مہتاب کا چہرہ
فطرت کے حسیں ہاتھ کا گوندھا ہوا سہرہ

مَیں سوچ رہا ہوں۔ میں یہی سوچ رہا ہوں

تو شاعرِ فطرت کی کسی نظم کا عُنواں
معصوم جوانی کے دل و جان کا ایماں
تو چاندنی راتوں میں کسی جھرنے کی آواز
تو ساز کے پردوں میں ترنم کا حسیں راز
گھومے جو تری آنکھ تو مدہوش بنا دے
مِل جائے نظر تیری تو مے نوش بنا دے

مَیں سوچ رہا ہوں، میں یہی سوچ رہا ہوں

اور دیکھ اُدھر جنسِ محبت کی مخالف
ہر حال میں افسانۂ الفت کی مخالف
ایماں کی بھی دشمن ہے یہ انسان کی دشمن
معصُوم امنگوں کے دل و جان کی دشمن

آ دیکھ ادھر آگ میں جلتی ہوئی دُنیا
یہ حرص کے شعلوں پہ مچلتی ہوئی دنیا

میں سوچ رہا ہوں، میں یہی سوچ رہا ہوں
ہے کون جو دنیا میں محبت نہیں کرتا
اِک بار کسی بُت کا یہاں دم نہیں بھرتا
دل دے کے زمانہ میں جو رُسوا نہیں ہوتا
جو آہ نہیں بھرتا جو شب کو نہیں روتا
پھر اپنی محبت پہ زمانہ کو جلن کیوں
دشمن یہ ہوا جاتا ہے اَب چرخِ کہن کیوں
میں سوچ رہا ہوں، میں یہی سوچ رہا ہوں

ہماچل

اَے ہماچل. اَے مرے سپنوں کے رنگیں تاجدار
تجھ پہ قرباں زندگی تجھ پر نچھاور ہے بہار
وقت کی آندھی میں لاکھوں کارواں گم ہو گئے
آج تک قائم ہے لیکن وہ ترا پہلا وِقار
آج بھی تجھ پر جھکی ہے رحمتوں کی کہکشاں
ذرّے ذرّے میں نہاں ہیں تیری عظمت کے نشاں
وادیوں میں تیری ملتا ہے محبت کو سکوں
ہر زباں کہتی ہے تیرے بانکپن کی داستاں
تیرے پہلو میں خوشی ہے اَور کوئی غم نہیں
گھاٹیاں ہیں پر سکوں اور آنکھ کوئی نم نہیں
تیری دوشیزہ ہر اک جنت سے آئی حُور ہے
تیرے اِنساں سچ تو یہ ہے دیوتا سے کم نہیں

تیرے گیتوں میں محبت، تیرے نغموں میں خمار
تیرے جھرنوں میں ترنم، تیرے پہلو میں بہار
رقص کرتی ہے تری پگ ڈنڈیوں پر زندگی
ہے تری پاکیزگی پر سب خدائی بھی نثار
تھک کے انساں زندگی میں تجھ سے پاتا ہے سکوں
غم پہ چھا جاتا ہے اکثر تیری رحمت کا فسوں
تیری چھاؤں میں چلے آتے ہیں اکثر قافلے
عقلِ انساں کو جکڑ لیتا ہے جب کوئی جنوں
سچ تو یہ ہے اے ہماچل اے محبت کی زباں
تجھ پہ ہوتا ہے ہمیں ہر وقت جنّت کا گُماں
رات دن جلتے ہیں تیری آرزوؤں کے کنول
تجھ سے مل کر اور بھی اٹھتا ہے اُوپر آسماں

○

گیت

لکشیہ کی اور بڑھتا رہا کارواں راستوں کی تھکن ہاتھ ملتی رہی
مَوت کے تیز جھونکے مچلتے رہے زندگی کی مگر جوت جلتی رہی
الجھنوں کی کھنکتی رہی شرنکھلا۔ بیڑیاں پاؤں کی اور بجتی رہیں
دلہنیں تو امنگوں کی لیکن اِدھر پھول چنتی رہیں اور سجتی رہیں
جام خوشیوں کے پیتی رہی زندگی مَوت بے نور سانچے میں ڈھلتی رہی
راستوں کی تھکن ...

لَٹ الجھتی گئی اور بھی رات کی۔ چاند جیتا گگن میں بکھرتا گیا
رنگ بھرتا گیا سوپن کی مانگ میں رُوپ کلیوں کا ہیم نکھرتا گیا
مستیوں کی لہر تتلیوں کی طرح پھڑپھڑاتی رہی اور چلتی رہی
راستوں کی تھکن ...

اپنا دامن پسارے بہت دیر تک پیار ملنے کی آشا میں جیتے رہے
بھاوناؤں کے شو کو لگا کر گلے آنسوؤں کے سمندر بھی پیتے رہے
ایکدم ٹوٹ کر پھر گرا آسماں ، دِل کی دنیا بہت دیر جلتی رہی
راستوں کی تھکن ....

جنم لیتی رہیں گیت کی پنکتیاں۔ ایک نغمہ ہواؤں میں گھلتا رہا
کلپنا جال بنتی رہی مدبھرے۔ رنگ موسم کے چہرے کا دُھلتا رہا
ایک سنگھرش میگھوں میں ہوتا رہا دھوپ آنگن میں خوشیوں کی پلتی رہی
راستوں کی تھکن ....

○

اِن میں آنسو ہی آنسو ہیں ان میں ایک وِیتھا پلتی ہے

اِسی لئے تو ساری دنیا۔ میرے گیتوں سے جلتی ہے

میرے گیت نہیں بکنے کے ۔ ان گیتوں کا مول نہ آنکو

ان کی شبداولی نہ پرکھو۔ ان کے انتستل میں جھانکو

ان گیتوں کی سوُر لہری میں سپنوں کی کایا ڈھلتی ہے ۔ اِسی لئے تو..

میرے گیت چھلکتے آنسو۔ میرے گیت برستے بادل

اِن میں ارمانوں کی مہندی۔ ان میں بھادوں کا گنگا جل

اِن گیتوں کے مکھ پر آندھی، اپنا تیج سوئم ملتی ہے ۔ اِسی لئے تو..

میرا اہم چھپا ہے انمیں۔ کتنوں کی تقدیر چھپی ہے

بھولے بسرے۔ ٹوٹے پھوٹے سپنونکی تصویر چھپی ہے

ان گیتوں میں سوئیم زندگی۔ مدرا بن کر ڈھلتی ہے۔ اسی لئے تو..

ٹانک چکا ہوں ان میں جانے۔ کتنی یادیں کتنے چہرے

گونتھ چکا ہوں ان میں ماتم شہنائی اور چنچل چہرے

ان گیتوں کے اُر میں جیسے۔ ایک نئی دنیا پلتی ہے۔ اسی لئے تو..

بھولے سے بھی ان گیتوں کو اَدھروں کا شنگار نہ کرنا

پردیسی ہیں، پردیسی سے۔ کبھی بھول کر پیار نہ کرنا

ان گیتوں کے انتستل میں غم کی اک دھارا چلتی ہے۔ اسی لئے تو..

قطعات

ہم نے پُرکیف بہاروں کا اثر دیکھا ہے
منجمد برف تلے ہم نے شرر دیکھا ہے
ہم تری چال میں آنے کے نہیں ہیں ہرگز
زندگی ہم نے تجھے بھر کے نظر دیکھا ہے

زندگی چاک سہی، چاک یہ سینا ہوگا
ہم نے مانا کہ یہ زہراب ہے، پینا ہوگا
زندگی موت کے ہاتھوں سے نہ کھا جائے شکست
اَے کنوَل ہمکو ہر اک حال میں جینا ہوگا

○

مَوت ہَے، زندگی کی شہنائی
زندگی مَوت ہی کا ماتم ہَے
فرق دونوں میں ہے تو بس اِتنا
ایک ہے زخم ایک مرہم ہے

○

ہر گھڑی واردات کہتے ہَیں
ڈوبتے دل کو تھام لیتی ہے
اشک بہتے ہیں ہر خوشی کے ساتھ
ہر خوشی انتقام لیتی ہَے

○

قہقہوں میں ایک لمبی سی گھٹن
ہاں کسی گہرے دھوئیں سے کم نہیں
اس میں پنہاں ہے مسلسل تیرگی
زندگی اندھے کنویں سے کم نہیں

○

رنگ پھولوں کا بیچنے والے
کیا بہاروں کی بات کرتے ہیں
لوگ دھرتی پہ رہ نہیں سکتے
چاند تاروں کی بات کرتے ہیں

○

مقدر میں ابھی جینا لکھا ہے اور جی لیں گے
چھلکتے جام اشکوں کے پیئے ہیں اور پی لینگے
گریباں چاک کر ڈالا مقدر نے تو غم کیسا
کنول لاکھوں سیئے ہیں زندگی پھر اور سی لینگے

ناز ڈالر کے اٹھائے نہیں جاتے ہم سے
گیت رو بل کے بھی گائے نہیں جاتے ہم سے
اپنے کھیتوں کی کنول کھائیں گے سادہ روٹی
کیک ذلت کے چبائے نہیں جاتے ہم سے

○

تو نہیں محفل میں لیکن تیرا افسانہ تو ہے
ہو نہ ہو یہ دل کسی کا۔ تیرا دیوانہ تو ہے
ہم پہ بھی نظرِ کرم۔ اے ساقیِ بزمِ حیات
گو شکستہ ہی سہی ہاتھوں میں پیمانہ تو ہے

○

ہم بھی سینے میں محبت کا شرر رکھتے ہیں
جو ہر اک چوٹ کو سہہ لے وہ جگر رکھتے ہیں
ہم نے مانا کہ زمیں پر ہیں مگر ہم پھر بھی
اے کنول چاند ستاروں پہ نظر رکھتے ہیں

○

مَیں آگ کے شعلوں میں ہَوا ڈھُونڈ رہا ہوں
اَور خاک کے پُتلوں میں خُدا ڈھُونڈ رہا ہوں
ناداں ہوں کنول آج کے اِس دَور میں دیکھو
نایاب سی اِک جنسِ وفا ڈھونڈ رہا ہُوں

تُو مجھ سے بہت دُور مگر دل کے قریں ہے
اَب تک بھی مجھے تیری محبت کا یقیں ہے
اِک بار کبھی تو نے مجھے دوست کہا تھا
اَب تیری کسی بات کا افسوس نہیں ہے

سَب لوگ محبت کی زباں ڈھونڈ رہے ہیں
پت جھڑ میں بہاروں کا سماں ڈھونڈ رہے ہیں
دُنیا تو کنول ڈھونڈتی پھرتی ہے خُدا کو
ہم پیار کے قدموں کے نشاں ڈھونڈ رہے ہیں

مجھکو موجوں سے ڈر نہیں لگتا
میں ہر اک تیز رَو سے اُبھرا ہوں
اَب تو گمراہ ہو نہیں سکتا
مَیں ہر اک رہگذر سے گزرا ہوں

○

شعر کہتا ہے جب کبھی شاعر
وہ خدا کے قریب ہوتا ہے
رُتبۂ شاعری کنولؔ لیکن
مُشکلوں سے نصیب ہوتا ہے

○

آ گئے ہیں تو بیٹھیئے دو پل
ایسی تقدیر پھر ملے نہ ملے
اک نظر ہنس کے دیکھ لو مجھکو
غم کی تصویر پھر ملے نہ ملے

○

جب کبھی زندگی کے کاغذ پر
مَیں لکیریں نئی لگاتا ہوں
لاکھ کوشش کے باوجود کنولؔ
اُن کو ٹیڑھی لکیر پاتا ہوں

○

اندھیرا ہے ذرا سی روشنی سے کم نہیں ہوگا
یہاں تو دل جلانے سے ملے گی روشنی تمکو
ہزاروں بار کانٹوں سے چھلیں گے پاؤں کے چھالے
بہت مہنگی پڑے گی زندگی سے دوستی تمکو

○

پھر آکے مرے دل میں وہ مہمان نہ ہو جائے
بے وجہ مری موت کا سامان نہ ہو جائے
کرنے کو پرستش تو کنولؔ کر لوں میں اس کی
ڈرتا ہوں وہ ظالم کہیں بھگوان نہ ہو جائے

○

ہر سمت پکار آئے ہیں ہم گاندھی کو
آواز مگر دل ہی کی محفل میں نہیں دی
پتھّر میں تراشا کبھی سکّوں میں بٹھایا
نوٹوں میں جگہ دی ہے مگر دل میں نہیں دی

○

سفیدے کے پیڑوں کی لمبی قطاریں
نہائی ہوئی دُودھ میں یہ بہاریں
یہ جھیلیں، یہ چشمے، یہ باغات شاہی
کنوَل نقش ہیں ہر طرف یادگاریں

○

مہکتے گلوں کی، بہاروں کی نگری
تھرکتے سفینوں، شکاروں کی نگری
خدا اس کے جلوؤں کو تابانیاں دے
بہت ہی حسیں ہے چناروں کی نگری

○

رہبروں کو، لیڈروں کو اور ادیبوں کو سلام
دیش کے رن بانکروں عبد الحمیدوں کو سلام
ذرّہ ذرّہ اس وطن کا کہہ رہا ہے اَے کنولؔ
دیش پر جو مر مٹے ہیں ان شہیدوں کو سلام

○

موت سے دن رات اَب مَیں کس لئے ڈرتا رہوں
چاپلوسی کس لئے اُس کی کنولؔ کرتا رہوں
سوچتا ہوں اَب بغاوت کے سِوا چارا نہیں
مَیں کہاں تک زندگی کی ہاں میں ہاں بھرتا رہوں

○

لوگ اکثر آکے مجھ سے پوچھتے ہیں یہ سوال
کیوں سدا دنیا کے سب انسان خوش رہتے نہیں
ہنس کے دیتا ہوں کنولؔ میں اُنکو یہ سادہ جواب
ایک دھارے پہ سفینے وقت کے بہتے نہیں

○

متفرقات

جگمگاتی چاندنی راتیں تصوّر آپ کا
یاد ہے اِتنا جہاں اندر جہاں بنتا گیا

ہے وقتِ صبح اٹھو مَیکشو وضو کر لیں
شفق کے رنگ میں رنگِ شرابِ احمر ہے

دِل بھی تم پر کر چکا ہوں، جان بھی تم پر نثار
اَب ارادہ اور کیا ہے بول اَے جانِ بہار

رنگین تتلیاں سی آنکھوں میں تیرتی ہیں
محسوس ہو رہا ہے، جیسے وہ آ رہے ہیں

ابھی سے لوگ اُٹھاتے ہیں انگلیاں مجھ پر
ابھی تو تم سے تعارف مرا ہوا بھی نہیں

خوشیوں کی بارات میں اکثر غم ہی نوشہ ہوتا ہے
دُلہن بن کر رو دیتا ہے ہر نغمہ شہنائی کا

حسیات اب بھی لئے گھومتی ہے سینے میں
جو تیر وقت کی اندھی کماں سے چھوٹ گیا

سمجھ کے سوچ کے ہم نے شکست کی تسلیم
سکونِ دل تو ملا۔ اِمتحاں سے چھوٹ گئے

ٹھیک ہی تھا کارواں کا یوں بھٹک جانا کنولؔ
جو بھی آیا ، آکے میرے کارواں بنتا گیا

یاد جب آپ کی بھولی ہوئی باتیں آئیں
یاد رہ رہ کے ہمیں چاندنی راتیں آئیں

ملے ہیں آپ ہمیں کتنے انتظار کے بعد
بہار آئی بڑی دیر میں بہار کے بعد

ڈی۔ راج۔ کنول ایم۔ اے